پوچھ مجھ سے!

اصغر شاد

پوچھ مجھ سے!

پیپلز پارٹی کے جیالے کارکن طاہر کھوکھر پر گیارہ سالہ
جلاوطنی کے دوران دیارِ غیر میں کیا بیتی

اصغر شاد کے قلم سے

پاران ایم ایچ پنھور انسٹیٽیوٹ آف سنڌ اسٽڊيز، ڄامشورو.

جملہ حقوق محفوظ ہیں۔

طبع اول ۔ جنوری ۱۹۹۰

قیمت ۔ مجلد ۴۰ روپے

طابع نفیس پرنٹر پٹیالہ گراونڈ لاہور

سرورق شیخ اے رحمٰن

ناشر۔ روہتاس بکس

احمد چیمبر 5 ٹیمپل روڈ لاہور۔

Digitized by M. H. Panhwar Institute of Sindh Studies, Jamshoro.
پاران ایم ایچ پنهور انسٽيٽيوٽ آف سنڌ اسٽڊيز، ڄامشورو.

انتساب

شہید ذوالفقار علی بھٹو کے نام جن کی قربانی کارکنوں کے لئے
مشعل راہ ہے

ستون دار پہ رکھے چلو سروں کے چراغ
جہاں تلک ستم کی سیاہ رات چلے

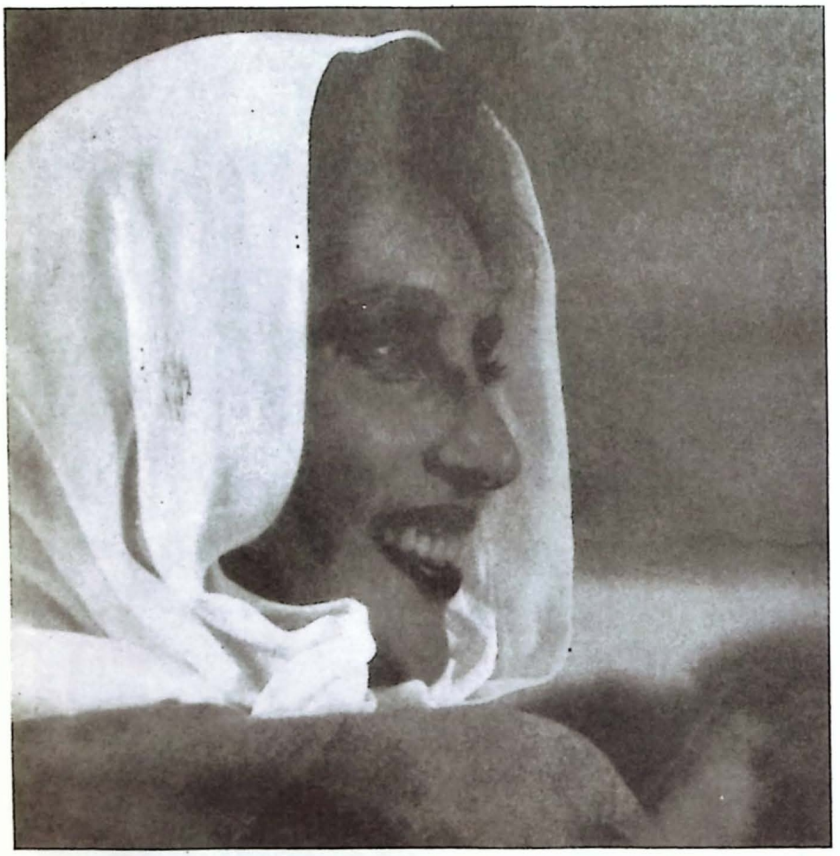

پیش لفظ

زیر نظر کتاب کے مطالعہ سے کچھ ایسا تاثر ذہن میں ابھرتا ہے جیسے کہ قاری کو اس لمحہ بہ لمحہ سفر سے پیوستہ کر دیا گیا ہے جس کا ذکر انتہائی سادہ مگر دلچسپ' اور خوبصورت پیرائے میں کیا گیا ہے -

لفظوں کے دلنشیں اور جامع الفاظ کے استعمال سے اس کتاب میں پر کشش جاذبیت پیدا کی گئی ہے - دراصل لفظوں کے استعمال کے لئے جہاں مصنف کے لئے گہرا مطالعہ اور ادب سے لگاؤ بے حد ضروری ہے وہاں قلم پر اس کی گرفت مضبوط ہونا اس سے بھی زیادہ ہے -

مذکورہ بالا کتاب میں طاہر کھوکھر کی سیاسی جدوجہد کا ذکر نوجوان صحافی اور مصنف محمد اصغر شاد' نے جس انداز میں کیا ہے اس سے ان کی ان صلاحیتوں کا بخوبی اظہار ہوتا ہے ان کا میدان صحافت میں ممتاز مقام ہے -

اصغر شاد کی دیگر تحریروں کی طرح اس کتاب میں جو ان کی کتابی شکل کی پہلی کوشش ہے اول تا آخر لڑی میں پروے ہوئے موتیوں کی مانند ہے جسے پڑھتے ہوئے ایک تسلسل کا احساس قاری کو بوریت سے بیگانہ بنائے رکھتا ہے' طاہر کھوکھر کے ساتھ ساتھ آزاد کشمیر' پاکستان' اور مشرقی و مغربی یورپ کے مختلف علاقوں کی روداد پر نظر دوڑاتے ہوئے قاری خود بھی ٹرین میں بیٹھے ہوئے کسی مسافر کی سی کیفیت میں ارد گرد کے مناظر کو تیزی سے پیچھے چھوڑتا چلا جاتا ہے' ایسے مناظر جو تا زندگی اس کے ذہن پر نقش ہو کر رہ جاتے ہیں - جبکہ نادر تصاویر کی شمولیت سے کتاب کے حسن کو دوبالا کرنے میں خاصی مدد ملی ہے

طاہر کھوکھر کی سیاسی جدوجہد کو اس قدر عمدہ اسلوب میں صفحہ قرطاس پر بکھیرنا میرے خیال میں شاید اس سے بہتر ممکن نہ تھا -

محمد نواز رضا
صدر راولپنڈی پریس کلب

ترتیب

1- آغاز گفتگو
2- سیاست میں آمد
3- "سماج" کا اجراء
4- بے نظیر بھٹو سے پہلی ملاقات
5- بے نظیر سے خصوصی انٹرویو
6- ضیاء کی کشمیر آمد
7- بھٹو کی تقدیر کا فیصلہ
8- فیصلے کا انتظار
9- اگر مجھے قتل کیا گیا
10- جب میں گرفتار ہوا
11- ملاقات پر پابندی
12- پولیس کا تشدد
13- منحوس سحر
14- اپنوں کی بے رخی
15- ملک سے فرار
16- کابل کی گلیاں
17- ترکی آمد
18- مشرقی یورپ روانگی
19- مشرقی یورپ کی سیر
20- مغربی برلن میں
21- پولیس کے چھاپے
22- سلاخوں کے پیچھے
23- ہسپتال منتقلی
24- کیس کا فیصلہ
25- تجارت کا آغاز
26- وطن واپسی

1

آغاز گفتگو

مشرقی ماحول خصوصاً پسماندہ علاقوں سے تعلق رکھنے والے نوجوانوں کا قومی سیاست یا دیگر معاملات میں کس قدر عمل دخل ہوتا ہے- یہ بات نہ تو کسی سے ڈھکی چھپی ہے- اور نہ ہی کبھی اس صورت حال کے پیش نظر اصلاح احوال کی جانب توجہ دینے کی کوشش کی گئی' میں بھی ایسے لاکھوں نوجوانوں میں سے ایک تھا' جو غربت' افلاس' بے چارگی' اور محرومیوں کے ہمراہ کسی نامعلوم اور بے ضرر سے خاندان میں جنم لیتے ہیں- ان خوش نصیب بچوں سے یکسر مختلف جو عرف عام میں سونے کا چمچ منہ میں لے کر اس جہاں میں آتے اور تاحیات راج کرتے ہیں- حالات چاہے کیسے ہی کیوں نہ ہوں' ان کی جانب باد مخالف کا رخ ہوا اور شاید نہ ہو گا'- البتہ مجھے اس بات پر بے حد فخر رہا ہے کہ میں ایک ایسے خاندان سے متعلق ہوں جو گزشتہ تقریباً ۸۰ سالوں سے نسل در نسل اپنے علاقے' قصبے' یا ملک کے نوجوانوں کو بساط بھر زیور تعلیم سے آراستہ کرنے میں مشغول ہے- یعنی محکمہ تعلیم سے وابستہ ہیں'- سیاست نام کی کوئی شے تو شاید پورے خاندان میں اس سے قبل کسی نے دیکھی' نہ سنی' والد صاحب' دادا' و پردادا محترم اساتذہ کرام کی صف اول میں شامل رہے ہیں-

اس حوالے سے میرا ابتدائی مدرسے میں جانا اور حصول تعلیم کے لئے ہاتھ پاؤں مارنا روائتی سی بات بھی تھی اور خاندانی وقار کا مسئلہ بھی'- لیکن اب حالات پہلے کی نسبت کافی تبدیل ہو چکے تھے تعلیمی اداروں میں سیاست کے جراثیم نہ صرف پلنے لگے تھے بلکہ منظم طریقہ سے ان کی پرورش کا سامان بھی پیدا کیا جانے لگا تھا' یہ بات کہاں تک درست یا طلبہ کے مفاد میں ہے- یہ ایک الگ بحث اور موضوع ہے- بہتر ہو گا کہ میں اپنی ذات کے حوالے سے صرف یہ کہوں کہ تعلیم کے دوران آجانے والی سیاسی سوجھ

بوجھ بقینا ایک ناپختہ ذہن کے طالبعلم کو صراط مستقیم بھی دکھا سکتی ہے اور اسے کسی دلدل میں دھکیلنے کا سبب بھی بن سکتی ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ملک میں منتخب وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو شہید کی حکومت تھی' ملک سیاسی' سماجی' اقتصادی اور سائنسی غرض تمام شعبہ ہائے زندگی میں ترقی کی منازل طے کرنے میں مصروف تھا'۔ میں اس وقت یعنی ۱۹۷۴ء میں گورنمنٹ پائلٹ سیکنڈری سکول میں میٹرک کا طالبعلم تھا' ریڈیو' ٹیلی ویژن پر بھٹو صاحب کی ولولہ انگیز تقاریر سنتا اخبارات میں ان کے بیانات پڑھتا' اور سوچا کرتا کہ یہی شخصیت میرا آئیڈیل ہے۔ اور پھر اس زمانہ سے میں نے اپنے ناپختہ ذہن کو یہ سبق یاد کروایا کہ اب سیاست کرنا ہے۔

اور قائد عوام کی سیاست کے اصولوں کو اپنانا ہے۔ چاہے اس میں میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے پہلی بار سکول میں سائنس اکیڈمی کے الیکشن کا انعقاد کیا گیا۔ اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور پھر یوں ہوا کہ یہ شوق بڑھتا ہی چلا گیا' میٹرک کے بعد ۷۶۔ ۱۹۷۵ء میں گورنمنٹ ڈگری کالج میر پور سے تعلیمی میدان کی سرگرمیوں کا آغاز کیا' والدین کی از حد خواہش تھی کہ میں میڈیکل یا انجینئرنگ کی لائن کا چناؤ کروں۔ لیکن میری ضد اور ہٹ دھرمی کے آگے وہ بظاہر بے بس سے دکھائی دیئے۔ میری اپنی لائن کا میرے خیال میں آغاز ہو چکا تھا! اس وقت تعلیم کے ساتھ ساتھ سیاست میں بھی دلچسپی پیدا ہوئی اور سٹوڈنٹس ویلفیئر سوسائٹی کے قیام سے اس کا باقاعدہ آغاز کیا' اس دوران میر پور کی تاریخ میں پہلی مرتبہ پرائیویٹ سطح پر' ادبی و کھیلوں وغیرہ کے سلسلے کا آغاز کیا'۔

کوئی بھی تنظیم اگرچہ معمول کے مطابق درست کام بھی کر رہی ہو تو بہر حال اس میں اصلاح کی گنجائش ہمیشہ رہی ہے یہ انسانی فطرت کا تقاضا بھی ہے' اور اصول قدرت بھی' اور ان دو باتوں سے انحراف نہیں کیا جا سکتا ہے

2

سیاست میں آمد

۷۶ء میں پی ایس ایف آزاد کشمیر میں شامل ہوا' یہ طلباء کی ایک منظم اور فعال تنظیم تھی بلکہ کہنا چاہیئے کہ اب بھی ہے- لیکن جس زمانے کی میں بات کر رہا ہوں اس وقت یہ آزاد کشمیر کے چند تعلیمی اداروں تک ہی محدود تھی ہماری عادت سی بن گئی ہے کہ اپوزیشن کی جانب ہمارا جھکاؤ سا رہتا ہے-اس کی وجوہات چاہے کچھ بھی ہوں لیکن یہ ایک حقیقت ہے بر سر اقتدار حکومت چاہے کوئی مناسب اقدام ہی کیوں نہ کر رہی ہو' حزب مخالف کے پر زور' بلکہ کہنا چاہیئے کہ منہ زور مخالفانہ پروپیگنڈہ نے ہمیں ہمیشہ متاثر کیا ہے-اور اسی روائتی صورتحال سے ہمیں بھی دوچار ہونا پڑ رہا تھا پی ایس ایف اس وقت کی پیپلز پارٹی کی حکومت کی ذیلی تنظیم تھی جس کے خلاف منفی بیان بازی اور دیگر وجوہات کے باعث لوگ ہم سے کتراتے' لیکن ہم تو عوام خصوصا طلباء کو یہ باور کرانا چاہتے تھے کہ پی ایس ایف طلباء کے مسائل کے حل کرنے کی کوشش کرنے والا ایک پلیٹ فارم ہے اور میں برملا کہوں گا کہ ہم اس میں خاصی حد تک کامیاب رہے'- ۷۷ء تک یہ مختصر سا دور انتہائی مصروفیت اور بے حد اہمیت کا حامل رہا' ہم لوگ اپنی محنت اور لگن سے طلباء میں ایک مقام بنانے میں خاصی حد تک کامیاب ہو گئے لیکن قوم کو ایک بار پھر سانحہ سے گزرنا پڑا جس کے خطرے کو ٹالنے کے لئے قائد عوام نے اپنا سب کچھ قربان کرنے کا عزم کر لیا تھا' انہوں نے نہ صرف اندرونی بلکہ بیرونی سامراج حتی کہ بین الاقوامی طور پر سپر پاورز سے ٹکر لینے کا مصمم ارادہ کر لیا'-

قائد اعظم کے بعد قوم کو ایک مرتبہ پھر ذوالفقار بھٹو کی شکل صورت میں مخلص- بے لوث' اور باصلاحیت رہنما مل گیا تھا

لیکن پاکستان اور اس کے عوام کے خلاف بین الاقوامی طور پر ہونے والی معمول کی سازشوں میں یکدم تیزی آ گئی۔ یورپی اخبارات کا زہر آلود پروپیگنڈہ تیز تر کر دیا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہر گز نہ تھی کہ پاکستان پر کون حکمرانی کر رہا ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ پاکستان ترقی کی شاہراہ پر چل نکلا ہے۔ اور اس کا رہبر کون ہے ذوالفقار علی بھٹو۔ جس نے ساری دنیا کو بتا دیا تھا کہ ہم اپنے ملک کی ترقی کے لئے ایٹم بم بنائیں گے اور ہمارے راستے میں آنے والی ہر رکاوٹ خس و خاشاک کی طرح بہا دی جائے گی۔ یہ خیالات و احساسات قوم کو ایک مرتبہ پھر بیدار کر رہے تھے' اسے بتا رہے تھے کہ ان کی بقا خود انحصاری میں مضمر ہے' دوسروں کے آگے کشکول کب تک پھیلائے رکھیں گے -- قوم نے قائد عوام کی اس صدا پر لبیک کہا لیکن یہودی اور ہندو عناصر ان تمام معاملات پر گہری نگاہ رکھے ہوئے تھے' اور پھر یہ ہوا کہ پاکستانی عوام کو ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کا منحوس سورج دیکھنا پڑا جب----

ملک میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا اور اس وقت کے چیف آف آرمی سٹاف جنرل ضیاء الحق ملک کے سیاہ و سفید کے بلاشرکت غیرے مالک بن بیٹھے تھے'۔ مجھ جیسے ناپختہ ذہن کے لاکھوں طلباء اس اچانک رونما ہونے والی صورتحال کو مکمل طور پر سمجھنے سے اگرچہ قاصر تھے'۔ لیکن چھٹی حس ان تمام عوامل میں چھپے کسی بڑے خطرے کی نشاندھی کر رہی تھی'۔ مارشل لاء کیا ہوتا ہے؟ اس کے ملکی معیشت' سیاست ثقافت اور دیگر شعبہ ہائے زندگی پر کیا اثرات مرتب ہوتے ہیں یہ ہماری روزمرہ کی سرگرمیوں کا موضوع بحث بن گیا'۔ ہم ایک ایسے پرندے کی مانند اپنے آپ کو محسوس کرنے لگے جسے فضاؤں میں تیرتے ہوئے اچانک دبوچ کر کسی ایسے پنجرے میں قید کر دیا جائے جو اس کی اپنی جسامت سے بھی چھوٹا ہو'۔

اخبارات پر سنسر شپ عائد کر دیا گیا عوام الناس کی زبان بندی کا حکم سنسر شپ کے لبادے میں لپیٹ کر جاری کیا جاتا ہے۔ کوئی بول سکتا ہے۔ نہ لکھ سکتا ہے۔ حاکم وقت کے تابعدار "دانشور" ایسے سہنری موقع سے خوب خوب فائدہ اٹھاتے' اور اپنے ہم عصروں کو بھی فائدہ اٹھانے کے "مفید" مشوروں سے نوازتے ہیں۔ کچھ ایسی ہی صورتحال سے ہم بھی دوچار تھے'۔ ملک کے تمام معروف اخبار بالا مر مجبوری

مارشل لاء کی حمایت میں مشغول تھے اگرچہ اس موقع پر بعض سر پھرے خوبصورت الفاظ کے مخمل میں لپیٹ کر مارشل لاء پر نشتر چلانے سے دریغ نہ کرتے لیکن مجموعی طور پر صورتحال مایوس کن تھی' جمہوریت کی بحالی کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا لیکن یہاں روزنامہ تعمیر' راولپنڈی' اور مساوات لاہور کا ذکر نہ کرنا قرین انصاف ہو گا جس میں کام کرنے والے صحافیوں نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر مارشل لاء کے خلاف اور بحالی جمہوریت کے لئے اپنے قلم کا بھرپور استعمال کیا- اور اس جرم کی پاداش میں اذیت ناک سزاؤں کے حقدار ٹھہرے-

3

"سماج" کا اجراء

غالباً فروری یا مارچ ۱۹۷۷ء کی بات ہے' دیگر سماجی و سیاسی سرگرمیاں تو آہستہ آہستہ محدود ہوتی جا رہی تھیں' مجھے اردو رسالے "سماج" کا ڈیکلریشن مل گیا'- ایسے وقت جب کہ پوری قوم بندوق کی نوک پر حرکت کر رہی ہو' اور حکومتی پارٹی کے سربراہ سمیت دیگر قابل ذکر رہنما زندان میں مستقبل کے تانے بانے بننے میں مصروف ہوں' مجھ جیسے نوعمر ناتجربہ کار اور نو وارد صحافی کے لئے صورتحال کا مقابلہ کرنا اور اپنے لئے کسی راہ کا تعین کرنا خاصا دشوار سا کام تھا'- بہرحال جولائی ۱۹۷۷ء میں "سماج" کا اجراء کر دیا گیا' اس موقع پر مجھے اپنے دیرینہ دوست ارشد واحد کی خدمات حاصل تھیں جو "سماج" کے اسسٹنٹ ایڈیٹر بھی تھے' جو آزاد کشمیر کی حمایت کرنے کے لئے خارزار راہوں پر چل نکلا'- اس دوران میں نے پی ایس ایف کے پلیٹ فارم پر زیادہ زوردار طریقہ سے سرگرمیوں کا آغاز بھی کیا اور میں ۷۸ء میں آزاد کشمیر پی ایس ایف کا صدر منتخب ہو گیا'- ان حالات میں مجھ پر دوسروں کی نسبت بظاہر زیادہ سخت ذمہ داریوں کا بوجھ آن پڑا لیکن اگر آپ کے ہمراہ سچی لگن اور محنت کی عظمت پر یقین رکھنے والے دوست ہوں تو پھر ناکامیوں کو ختم نہ بھی کیا جا سکے تو کم از کم انہیں دور بھگایا جا سکتا ہے-

حالات پر کس کا زور چلا ہے'- وقت بدلنے کو لمحوں کی ضرورت ہے لیکن انسان کی یہ بدقسمتی بھی رہی ہے کہ بعض اوقات یہ لمحے' مہینوں' سالوں' بلکہ صدیوں کا روپ دھار لیتے ہیں- انسان پرعزم ہو تو موت کے منہ میں بھی جاتے ہوئے پرامید ہوتا ہے- اگر اس نے اپنی معمول کی زندگی میں کوئی نیک عمل کیا ہے تو اس کو جاری رکھنے والے سینکڑوں بلکہ لاکھوں پیدا ہو جائیں گے بالکل اسی طرح جس طرح

بیگم نصرت بھٹو کے ساتھ یادگار تصویر

ذوالفقار علی بھٹو نے فرعون جیسے ظالم سربراہ کے آگے سر جھکانے سے انکار کیا اور آج بھٹو کی پارٹی پوری شان سے ملک کے اقتدار کو بحسن و خوبی چلا رہی ہے جس کی قیادت بھٹو شہید کی صاحبزادی محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہاتھ میں ہے - اس بحث کا حاصل یہ ہوا ہے کہ اکیلا انسان کچھ نہیں، لیکن اگر اکیلا انسان باصلاحیت ہو تو اپنے مزاج کے دوست دریافت کر لینا اس کے لئے چنداں مشکل نہ ہو گا'-

پھر وہی ہوا کہ مارشل لاء کے تاریک دور میں ہم نے پی ایس ایف کو نہ صرف منظم کیا بلکہ اسے متحرک کرنے کی سعی بھی کی، میر پور کالج میں پہلی مرتبہ ہماری یونین تشکیل دی گئی مظفر آباد اور کوٹلی نے بھی اپنی شمولیت کا اظہار کر دیا'- یہاں مجھے افسوس سے کہنا پڑے گا کہ پیپلز پارٹی کے سرکردہ لوگوں کی ہمیں صرف زبانی حمایت حاصل رہی عملی طور پر سب اپنے دفاع پر لگے ہوئے تھے، ہم حالات کی نزاکت کو مد نظر رکھ کر پھونک پھونک کر قدم اٹھاتے آہستہ آہستہ آگے بڑھتے رہے آزاد کشمیر میں بریگیڈیر حیات کی حکومت تھی جنہیں ظاہر ہے کہ زبردستی کشمیری عوام پر مسلط کر دیا گیا جنہوں نے پاکستان میں ضیاء الحق کی طرح آزاد کشمیر میں جمہوریت کا گلا گھونٹ رکھا تھا اور پوری کوشش کر رہے تھے کہ ضیاء الحق کا حکم بجالائیں طاقت کا استعمال تو عام تھا سیاسی حربوں کی چال چلی جاتی - میرے والد صاحب کو چیف سیکرٹری نے تبادلے کی دھمکی دی، ذہنی طور پر پریشان کرنے کی کوشش کی گئی، ڈپٹی کمشنر نے ایک روز بلا کر کہا کہ اپنے لڑکے کو سنبھالیں، کیونکہ اب حالات خاصے ہمارے حق میں ہیں، لیکن تمہارا لڑکا بے لگام ہے - چونکہ میرے والد صاحب ہمیشہ سے بے باک اور حق گو رہے ہیں انہوں نے تو برملا کہا کہ بھائی وہ بالغ لڑکا ہے - میری ہدایت کے مطابق اگر وہ سیاست کر رہا ہے تو آپ مجھے کہیں، میں اپنے آپ کو مجرم تصور کر لوں گا-

بہر حال بعد ازاں والد محترم نے ایک روز مجھے کہا کہ "مسٹر آپ اپنا بوریا بستر گول کریں - دراصل ان کے پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا ایک جانب میری سیاست تھی اور دوسری جانب ان کی ۲۵ سالہ سروس کا مسئلہ تھا لیکن ہم پر تو بھوت سوار تھا کہ کسی طرح ذوالفقار علی بھٹو کی رہائی کا وسیلہ پیدا ہو، چونکہ گھر سے

پیپلز پارٹی آ

قتل کا مقدمہ درج کیا جائے میر مرتضیٰ بھٹ

ماہنامہ
میرپور
آزاد کشمیر
سماج
مدیر: محمد طاہر کھوکھر

جلد نمبر ۲ شمارہ نمبر ۹	جمعہ ۲۵ مئی ۱۹۷۹ء	مقبوضہ کشمیر قیمت ۵۰ پیسے

نوڈیرو: جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کی قبر پر عوام فاتحہ خوانی کر رہے ہیں۔

جناب بھٹو کو پھانسی نہیں دی گئی

کراچی سماج رپورٹ پورے پاکستان میں
اس وقت ایک ہی سوال زیر بحث ہے اور وہ یہ کہ کیا
چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دی گئی تھی یا یہ کہ پھانسی
سے قبل ہی انہیں شدید جسمانی اذیتیں دے کر ہلاک کر دیا
تھا ...

آنکھیں اور زبان باہر نکل آتی ہیں مگر مسٹر بھٹو کی زمینوں
کے اسسٹنٹ منیجر مسٹر عبدالقیوم نے جو مسٹر بھٹو کا آخری
دیدار کرنے والے لوگوں میں شامل تھے حلفیہ طور پر بتایا ہے
کہ مسٹر بھٹو کے چہرے کی حالت بالکل ٹھیک تھی ان کی

تیزی کے ساتھ لاڑکانہ تدفین کے لئے روانہ کر دی۔
پاکستان میں اب یہ مطالبہ بھی شدت اختیار کرتا جا رہا
ہے کہ صحیح صورت حال کا پتہ چلانے کے لئے لاش
کا پوسٹ مارٹم کرایا جائے تاکہ قتل کے اصل اسباب
معلوم ہو سکیں۔ افواہوں میں اتنی شدت ہے کہ آج

ماہنامہ سماج مئی 1979ء کے شمارے کا عکس جس میں پہلی مرتبہ جنرل ضیاء کا کارٹون شائع کیا گیا

باضابطہ طور پر بے دخل قرار دے دیئے گئے لہٰذا رہنے کو کوئی مقام تو درکار ہوتا ہے۔ ایسے میں پیپلز پارٹی کے ایک کارکن بشیر ندیم نے میری بھرپور مدد کی' ان کی نانگی بازار میں ایک دوکان تھی جس کے اوپر خالی ایک کمرہ مجھے دے دیا گیا'۔ گھر میں رہ کر میں گھر نہ جاسکتا تھا'۔ چند قدم کے فاصلے پر مقیم میرے والدین اور بھائی مجھ سے مل نہ سکتے تھے'۔ لیکن میں خود ہی ان کی مشکل حل کر دیتا اور جب والد صاحب گھر سے کہیں باہر ہوتے تو میں چوری چھپے گھر جاتا اور اپنی ماں کی دعاؤں کے ہمراہ واپس آ جاتا جو کہ میری مالی مدد بھی کر دیا کرتی تھیں۔

میرے اندرونی حالات کا بظاہر تو کسی کو علم نہ تھا لیکن پھر بھی پیپلز پارٹی کے رہنما یہ بات بخوبی جانتے تھے کہ میں کن حالات سے دوچار ہوں۔ اپنا میگزین بھی تھا'۔ مساوات کی رپورٹنگ تھی اور پی ایس ایف کی سرگرمیاں بھی ساتھ ساتھ تھیں۔ کوشش یہ ہوتی کہ کسی کو دگرگوں حالات کا علم نہ ہونے پائے۔ میں اس دوران اکثر اوقات لاہور بھی جاتا لیکن افسوس اس وقت یہ تھا کہ بعض دوست بھی یہ سمجھتے کہ شاید مجھے پارٹی کا کوئی فرد مدد فراہم کر رہا ہے۔

معزز قارین کیا آپ یقین کریں گے کہ میں دو روپے میں میرپور سے لاہور آتا جاتا رہا ہوں' میں نے سٹوڈنٹس کارڈ کا بھرپور فائدہ اٹھایا جگہ جگہ قیام کرتا اور بعض اوقات بغیر ٹکٹ کے سفر کرتا رہا۔ یہ سب میں کس لئے کر رہا تھا میرا ایک مشن تھا' نظریہ تھا اور جب انسان اپنے نظرے پر عمل پیرا ہونے کا عزم کرے تو پھر اس کے لئے کوئی مشکل رکاوٹ نہیں بن سکتی اور میں تو ایک ایسے عظیم لیڈر کا چاہنے والا تھا جس نے دنیا کی تاریخ بدل کر رکھ دی تھی جس نے سپر پاورز کو برملا کہہ دیا تھا کہ ہم نہیں تم ہمارے دست نگر ہو'۔

4
بے نظیر بھٹو سے پہلی ملاقات

یہ غالباً فروری ۱۹۷۸ء کی بات ہے کہ ایک دن اس وقت کے پیپلز پارٹی آزاد کشمیر کے صدر پیر جان علی شاہ کا ایک پیغام کرنل منیر حسین صاحب کی وساطت سے مجھے ملا' میں اس روز محلے میں ایک شادی کی تقریب میں مصروف تھا- کرنل موصوف مجھے ڈھونڈتے ہوئے مذکورہ تقریب میں آن پہنچے' اور علیحدگی میں بلا کر کہا کہ آپ ابھی پیر علی جان شاہ کے پاس پہنچیں کوئی ضروری کام ہے- میں فارغ ہونے کے فوراً بعد پیر صاحب کے پاس آیا تو انہوں نے کہا کہ تم ابھی لاہور روانہ ہو جاؤ- وہاں سے بیگم نصرت بھٹو کا پیغام آیا ہے کہ ماہنامہ سماج کے ایڈیٹر طاہر کھوکھر کو فی الفور میرے پاس بھیجیں'- پھر دوسرے ہی لمحے لاہور جانیوالی بس کی سواریوں میں میں بھی شامل تھا'- تاخیر کے باعث پنجاب یونیورسٹی میں اپنے دوستوں کے پاس ہاسٹل میں ٹھہرا- اس وقت بیگم بھٹو G-۳۱ گلبرگ میں قیام پذیر تھیں تاخیر کے باوجود میں وہاں گیا تو چوکیدار نے کہا کہ آپ صبح تشریف لائیں- اگرچہ وہاں خفیہ ایجنسیوں کی فوج ظفر موجود تھی لیکن کسی نے مجھ سے اس وقت آنے کا استفسار نہ کیا- خیر میں دوسرے دن جب صبح پہنچا تو معلوم ہوا کہ بیگم صاحبہ تو کسی ضروری کام کے سلسلے میں کراچی روانہ ہو گئی ہیں

محترمہ بے نظیر بھٹو صاحبہ تعلیم مکمل کر کے انگلستان سے یہاں واپس پہنچ چکی تھیں میں نے محترمہ بے نظیر کی موجودگی کو موقع غنیمت جانا اور انٹرویو کے لئے درخواست کر دی' مجھے تین گھنٹے کے بعد کا وقت دیا گیا یہ تین گھنٹے میں نے بڑے شش و پنج میں گزارے کیونکہ میں اس ملک کے ہی نہیں دنیا کے عظیم لیڈر کی صاحبزادی سے ایک صحافی کی حیثیت سے ملنے جا رہا تھا جب میں اندر گیا تو میں نے

محترمہ بے نظیر بھٹو سے بات کی انہوں نے کہا کہ بیگم صاحبہ تو تین چار دن کے بعد واپس آئیں گی'۔

بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اس وقت محترمہ بے نظیر بھٹو کو اردو میں کوئی زیادہ شغف نہ تھا جب کہ ان کا سیکرٹری ضیاء الرحمن نامی جو جوان تھا وہ ایک عمدہ ترجمان بھی ثابت ہوا ' کیونکہ میں انگریزی بول یا لکھ تو ضرور سکتا تھا لیکن اس معیار کی نہیں جیسی بے نظیر جیسی اعلیٰ تعلیم یافتہ خاتون کے ساتھ مجھے بولنی چاہیے تھی اور مجھ جیسے نووارد صحافی کے لئے ان کا انٹرویو جہاں بہت بڑا اعزاز تھا وہاں کوئی اتنی آسان بات بھی نہ تھی مختلف موضوعات پر سیر حاصل انٹرویو کیا' جو اس وقت کے سماج میں شائع ہوا ' اور پھر جب تقریباً 5 سال کے بعد دوبارہ میری ان سے فرینکفرٹ مغربی جرمنی میں ملاقات ہوئی تو مجھے ان کے مزاج اور شخصیت میں سوائے اس کے کوئی واضح فرق محسوس نہ ہوا ' کہ اب وہ خاصی بردبار خاتون نظر آئیں شاید اس کی وجہ گزرے ہوئے تلخ ماہ و سال کا گہرا اثر ہو'

میں ذکر کر رہا تھا لاہور میں کئے گئے انٹرویو کا'۔ ہاں! مجھے یاد آیا اس وقت بد قسمتی سے میرے ساتھ کوئی فوٹو گرافر نہ تھا جو ان لمحات کو سلولائیڈ پر ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیتا--- انٹرویو شائع ہوا ' خاصی تعریف اور حوصلہ افزائی کی گئی لیکن بعض مخالف حلقوں کی جانب سے کہا جانے لگا کہ پارٹی نے اسے بھرپور مالی امداد کی ہے لیکن میں نے وطیرہ بنا رکھا تھا کہ ان کی باتوں کو سنی ان سنی کر کے اپنے کام سے کام رکھا جائے کیونکہ مجھے اسی میں نہ صرف اپنی کامیابی بلکہ سکون بھی میسر آتا تھا اور انسان کو جس کام میں دونوں ایسی بے مثال چیزیں یکمشت حاصل ہوں تو کون بیوقوف اس کام سے منہ موڑے گا۔

دراصل ہمارے ہاں سماجی طور پر اس بات کی تعلیم دی جانے کی اشد ضرورت ہے کہ جو شخص کوئی اچھا کام کر رہا ہے اس کو ٹوکنے کی بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی جائے اور اس کی حوصلہ شکنی سے اجتناب برتا جائے'۔

کیونکہ یہ بات ہمیں ہمارے قائد نے بتائی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ جس روز یہ احساس ہمارے ہاں پیدا ہو گیا اس روز سے ہماری قوم کا مقدر سنور جائے گا۔

بھٹو شہید کی ۵۱ ویں سالگرہ کے موقع پر بیگم نصرت بھٹو کے ہمراہ

اس کے لئے نہ صرف چھوٹے طبقے بلکہ اعلیٰ طبقے کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے اور اس روش کو ختم کرنے میں پہل کرے جس میں روز بروز خطرناک حد تک اضافہ ہو رہا ہے۔ جو نہ تو ہماری قومی بلکہ دینی اقدار کے بھی منافی ہے۔

5
بے نظیر سے خصوصی انٹرویو

بحیثیت ایڈیٹر "سماج"

نوٹ - زیر نظر انٹرویو مسٹر طاہر کھوکھر نے محترمہ بے نظیر بھٹو وزیر اعظم پاکستان سے اس وقت کیا' جب وہ جنوری 1978 میں تعلیم مکمل کرنے کے بعد لندن سے پاکستان آئیں - ان کا یہ انٹرویو لاہور میں ان کی رہائش گاہ پر لیا گیا جو غالبا پاکستان میں ان کا کسی بھی حوالے سے پہلا انٹرویو تھا جسے من و عن شائع کیا جا رہا ہے -

دختر پاکستان اور نوجوان نسل کی عظیم قائد مس بے نظیر بھٹو سے انٹرویو لینے کے لئے جب میں لاہور مس بے نظیر بھٹو کی رہائش گاہ پر پہنچا تو وہاں پر ملاقاتیوں کا ایک بہت بڑا ہجوم تھا - لیکن تھوڑی سی تگ و دو کے بعد مجھے وقت مل گیا اور میں نے مس بے نظیر بھٹو سے انٹرویو لینا شروع کر دیا جوں جوں میں سوالات کرتا جاتا ایسے لگتا جیسے میں ایک بہت ہی منجھے ہوئے اور پائے کے سیاستدان سے بات کر رہا ہوں میرا پہلا سوال ان کی ذاتی زندگی سے متعلق تھا کہ آپ نے ۱۹۷۷ء میں ایک اخباری بیان دیا تھا جس میں آپ نے کہا تھا کہ میں عملی سیاست میں حصہ نہیں لوں گی - لیکن اب ایسی کونسی مجبوریاں آ گئی ہیں جنہوں نے آپ کو عملی سیاست میں حصہ لینے پر مجبور کیا مس بے نظیر بھٹو نے میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا کہ جس وقت میں نے یہ بیان دیا تھا اس وقت میرے والد وزیر اعظم تھے اس وقت اگر میں سیاست میں حصہ لیتی تو لوگ کہتے کہ اپنے باپ کے نام کو استعمال کر کے مشہور ہونا چاہتی ہے حکومتی وسائل استعمال کر کے اپنا نام پیدا کرنا چاہتی ہے پھر میرے والد کو ایک بین الاقوامی سازش کے تحت ہٹایا گیا یہ سازش امریکہ کے یہودیوں کی تھی جو ساری دنیا میں اپنا غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ان کے راستے کی سب سے بڑی چٹان میرے والد صاحب

تھے مجھے جب اس سازش کا پتہ چلا تو پاکستان کا شہری ہونے کی حیثیت سے میرا فرض تھا کہ میں اس سازش کو بے نقاب کرتی اور اس ملک کے عوام کو صحیح حقائق سے روشناس کراتی اگر میں اس وقت بیرون ملک ہی رہتی تو میرا ضمیر ساری زندگی مجھے معاف نہ کرتا میں اس دنوں امور خارجہ کے امتحان کی تیاریوں میں مصروف تھی لیکن میں امتحان کے فوراً بعد ملک و قوم کی سلامتی کی خاطر پاکستان آ گئی میں کسی ڈر اور خوف کے بغیر ملک دشمن عناصر کو بے نقاب کرنے کے لئے میدان عمل میں کود پڑی اور آج تک اس فرض کو نبھا رہی ہوں اور فرض کو نبھاتے ہوئے میری جان بھی چلی جائے تو مجھے کوئی پروا نہیں ہو گی۔

میں نے بات کاٹ کر پوچھا لیکن یہودی اور سامراجی صرف بھٹو صاحب کے خلاف ہی کیوں ہیں۔

مس بے نظیر کہنے لگیں یہودی اور سامراجی جیسا کہ میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ سامراجی اور امریکہ کے یہودی ساری دنیا میں اپنا غلبہ حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

لیکن اب بھٹو صاحب پاکستان کو غلامی کے پنجے سے چھڑانا چاہتے تھے۔ وہ شروع ہی سے سامراجیوں اور یہودیوں سے برسرپیکار تھے پھر انہوں نے صرف پاکستان ہی نہیں بلکہ ساری دنیا کے غریب اور مظلوم قوموں کو ایک پلیٹ فارم پر جمع کرنے کی کوشش شروع کر دی انہوں نے تیسری دنیا کے عوام کو ایک طاقت بنا کر پیش کرنے کی کوششیں شروع کر دیں امریکہ اور یورپ کے یہودیوں اور سامراجی قوموں کے لئے یہ ایک کھلا چیلنج تھا اسی لئے انہوں نے مل کر اور باہمی گٹھ جوڑ کر کے بھٹو صاحب کو اقتدار سے محروم کر دیا لیکن وہ بھول گئے کہ بھٹو صاحب صرف حکومت کے ایوانوں میں ہی نہیں بلکہ سات کروڑ عوام کے دلوں میں بھی رہتے ہیں آج سارے پاکستان میں بھٹوازم کا جو ریلا آیا ہوا ہے اس کو امریکہ کے یہودی کیا ساری دنیا کی سامراجی طاقتیں بھی نہیں ختم کر سکتی میں نے بات کا رخ موڑتے ہوئے پوچھا کہ آجکل پیپلز پارٹی میں انتشار کی باتیں گردش کر رہی ہیں۔ ان باتوں میں کہاں تک صداقت ہے کیا ان باتوں سے پیپلز پارٹی کی مقبولیت میں فرق نہیں پڑتا میرے سوال کا جواب دیتے ہوئے دختر پاکستان نے کہا کہ پیپلز پارٹی چار بنیادی

اصولوں پر قائم ہے یعنی اسلام ہمارا دین ہے جمہوریت ہماری سیاست ہے مساوات محمدی ہماری معیشت ہے اور طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں آج سے گیارہ سال پہلے بھی ہمارے یہی اصول تھے اور آج بھی ہماری پارٹی کا ایک ایک کارکن انہی اصولوں پر کاربند ہے پارٹی میں انتشار کی خبریں آج کی نہیں بلکہ گذشتہ دو تین ماہ سے گردش کر رہی ہیں اگر ان میں صداقت ہوتی تو اب تک پیپلز پارٹی کئی گروپوں میں بٹ چکی ہوتی۔

لیکن ہم اب بھی متحد ہیں۔اور سارا پاکستان جانتا ہے۔ کہ ہم ایک مقصد اور دھن کی خاطر جدوجہد کر رہے ہیں۔ہمارا قافلہ مزدوروں' کسانوں طالب علموں اور محنت کشوں پر مشتمل ہے۔ کتنی عجیب بات ہے۔ کہ ہمارے انتشار کی خبریں پھیلانے والے خود ریزہ ریزہ ہو گئے۔ہم نے پہلے ہی کہا تھا کہ یہ مختلف ذہن رکھنے والے لوگ ایک نہیں ہو سکتے۔یہ ایک دوسرے کو کاٹ رہے ہیں۔ آپس میں لڑ رہے ہیں۔ادھیڑ عمر میں بھی کرسی کو حاصل کرنا چاہتے ہیں اور اس کو حاصل کرنے کی خاطر ایک دوسرے سے دست و گریبان ہیں۔ عوام ان کے لڑنے جھگڑنے کا تماشا دیکھ رہے ہیں خود ہی ان لوگوں نے اتحاد بنایا تھا۔اور خود ہی اس کو توڑ رہے ہیں۔اور اپنی انا کی جھوٹی تسکین کی خاطر اخباروں میں بیانات دے رہے ہیں۔ کہ پیپلز پارٹی والے ایک دوسرے کے خلاف بیان دے رہے ہیں۔اب آپ خود ہی اندازہ لگائیں کہ انہوں نے پاکستان کے عوام کو بے وقوف اور جاہل سمجھ رکھا ہے۔ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ عوام بغیر سوچے سمجھے ہمارے پیچھے پیچھے چلی آئے گی۔ حالانکہ یہ شدید قسم کی فہمی میں مبتلا ہیں۔

میں نہیں کہتی۔ کہ پیپلز پارٹی مقبول ہے۔یا یہ ایک بہت بڑی طاقت ہے۔ہم صرف اتنا کہتے ہیں۔ کہ غیر جانبداری سے الیکشن کرا دو۔اور پھر دیکھو کہ کس کی اکثریت ہے۔

میں نے اس کے بعد سوال کیا۔ کہ یہ لوگ الیکشن کرائیں گے۔ بھی یا یونہی عوام سے جھوٹے وعدے دیتے رہیں گے۔

دختر پاکستان کا جواب تھا۔یہ بات تو آپ کو ضیاء صاحب سے پوچھنی چاہئے تھی۔ جو ساری قوم کو کبھی خدا کے نام پر کبھی اسلام کی نام پر' کبھی رسول کے نام پر' کبھی

احتساب کے نام پر' عوام کو جھوٹی تسلیاں دے رہے ہیں کرسی کی لالچ بہت خراب چیز ہے- یہ بڑے بڑے مومنوں کو بھی نہیں بخشتی- پہلے ان لوگوں نے کہا-۱۸ اکتوبر کو ہر حالت میں الیکشن ہوں گے- ہر چیز تیار ہے- یہ لوگ جوش میں آ کر اقوام متحدہ میں ساری دنیا کے نمائندوں کے سامنے کہہ بیٹھے- کہ تاریخ پر لکھا جا چکا ہے- کہ ۱۸ اکتوبر کو الیکشن ہوں گے- لیکن دوسرے ہی دن جنرل صاحب نے الیکشن کو غیر مدت تک کے لئے ملتوی کر دیا اور احتساب کا ڈھونگ رچایا-

پھر ہم نے کہا کہ دسمبر میں الیکشن کروائیں ان لوگوں نے جواب دیا- کہ دسمبر میں موسم سرما کی وجہ سے الیکشن نہیں کرائے جا سکتے یہ ان لوگوں کی نئی منطق تھی- حالانکہ پاکستان کا ایک ایک فرد جانتا ہے کہ ۱۹۷۰ کے الیکشن دسمبر کے مہینے میں ہوئے تھے- دسمبر میں کہنے لگے کہ ملک خطرے میں ہے اس لئے الیکشن نہیں ہو سکتے مَلک خطرے میں ہے- اس لئے صرف غریبوں کو کوڑے لگاؤ بڑے بڑے سرمایہ داروں کو مت لگاؤ-

میں نے باتوں کو ایک نیا رخ دیتے ہوئے بے نظیر بھٹو سے دریافت کیا کہ ولی خان کے متعلق سارا زمانہ جانتا ہے کہ وہ ملک دشمن ہے لیکن اس کے باوجود فوجی حکومت نے گذشتہ دنوں ولی خان کو بے قصور کہہ کر رہا کر دیا ہے جن لوگوں کے متعلق سپریم کورٹ بھی فیصلہ کر چکی ہے کہ وہ ملک دشمن سرگرمیوں میں مصروف ہیں کیا ولی خان واقعی محب الوطن ہیں اور ان کی رہائی سپریم کورٹ کے فیصلوں کے مطابق ہے-

میرے اس سوال پر مس بے نظیر ذرا جذباتی ہو گئیں انہوں نے جواب دیا کہ یہ سوال آپ ضیاالحق سے پوچھئے میں تو ایک غدار کی بیٹی ہوں غدار میرا باپ ہے باقی سب محب الوطن ہیں جو لوگ سرحدی گاندھی کہلوانا فخر سمجھتے ہیں اور جن کا میل ملاپ کانگریس سے تھا وہ محب الوطن قرار پائے اور ہم غدار ہیں کیونکہ ہم نے ایٹمی پلانٹ خریدنے کی جرات کی ہم نے تیسرے دنیا کی سربراہ کانفرنس بلانے کی تجویز پیش کی-

6
ضیاء کی کشمیر آمد

ضیاء الحق نے جب سے جابرانہ طور پر حکمرانی سنبھالی تھی تو وہ پہلی مرتبہ جولائی ۱۹۷۸ء آزاد کشمیر میں منگلا کے مقام پر آئے تھے' جہاں پر انہوں نے کسی پروگرام میں شرکت کرنا تھی' یہ ہمارے لئے ایک سنہری موقع تھا کہ ہم ان کی آمد پر آزاد کشمیر میں کوئی احتجاجی مظاہرہ کریں میں اس وقت پی ایس ایف کا صدر تھا اور میرے ہمراہ سینکڑوں طلباء جو بھٹو ازم پر نہ صرف یقین رکھتے بلکہ اس کے لئے کٹ مرنے کو تیار تھے' ہم نے پروگرام بنایا اور انتظامیہ سے قبل از وقت بات چیت کرلی تا کہ قانونی طور پر ہم کسی جرم کے مرتکب نہ ہوں' لیکن انتظامیہ نے حتی الوسع کوشش کی کہ ہم اس چیز سے باز آجائیں لیکن وہ شاید یہ نہ جانتے تھے کہ کارکن جب ایک بات کا صدق دل سے فیصلہ کرلیں تو پھر انہیں کوئی پیچھے نہیں ہٹا سکتا'

ان کی آمد پر ہم جو تقریباً ۳۰ یا ۳۵ طلباء وفد کی صورت میں وہاں پہنچے لیکن وہ ہم سے قبل ریسٹ ہاؤس کے اندر جا چکے تھے - ہم نے انتظامیہ کو کہا کہ ہم انہیں طلباء کے مسائل سے آگاہ کرنا چاہتے تھے لیکن انہیں یہ بات پوری طرح معلوم تھی کہ ہمارا پروگرام ہے کہ احتجاجی مظاہرہ کیا جائے -

اس موضوع پر کافی دیر مذاکرات ہوتے رہے اور اعلی افسران نے اندر ہی اندر نہ جانے کیا فیصلہ کیا کہ یکدم ہمیں چاروں جانب سے آرمی نے گھیر لیا اور ٹرکوں میں بٹھا کر منگلا چوکی میں لے جا کر بند کر دیا--- یہ صورتحال ہمارے لئے اچانک ضرور تھی لیکن غیر متوقع نہ تھی کیونکہ ہمیں بخوبی علم تھا کہ انتظامیہ بے بس اور مجبور ہے - ایک مطلق العنان حکمران کے سامنے بولنے کے لئے بڑے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے جب کہ انتظامیہ کے افسران تو اپنی نوکری پکی

کروانے کے چکر میں ہمیشہ سے مبتلا رہے ہیں۔

یہ سارا دن ہم نے بھوک پیاس کی حالت میں عارضی نظر بندی کی صورت میں کاٹا اور اس وقت ہمیں چھوڑا گیا جب جنرل ضیاء واپس پاکستان کی حدود میں داخل ہو گئے۔ رہائی کے وقت انتظامیہ کے تمام اعلیٰ افسران نے آ کر نہ صرف معذرت کی بلکہ اپنی مجبوری ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ یہ ہماری ڈیوٹی تھی اور ہم مجبور تھے' انہوں نے ہمیں خدا کے واسطے دیئے کہ آپ نے اس واقعہ کو اخبارات میں شائع نہیں کرانا۔ خصوصاً مجھے تنبیہ کی گئی کہ اگر ایسا کیا گیا تو یہ اخلاقی بد دیانتی ہو گی۔ لیکن میرا جواب تھا کہ میں اس قسم کا کوئی وعدہ نہیں کرتا دوسرا کوئی شخص ایسا وعدہ کرے تو میں اس کا ذمہ دار نہیں۔

بہر حال۔ رہائی کے فوراً بعد میں نے تعمیر اور مساوات میں اس واقعہ کی تفصیلی خبریں بھجوا دیں۔ جو دوسرے دن شہ سرخیوں سے شائع ہوئیں اس پر انتظامیہ والے بڑے جز بز ہوئے لیکن کیا کر سکتے تھے سوائے سر پیٹنے کے !!

7

بھٹو کی تقدیر کا فیصلہ

ہائیکورٹ سے بھٹو شہید کی قسمت کا فیصلہ ۱۹۷۸ء میں صادر کر دیا گیا- اس قدر غیر متوقع فیصلے سے ایک سنسنی پھیل گئی'-یقین نہ آتا تھا' اس ضمن میں پاکستان کی طرح آزاد کشمیر میں بھی احتجاجی سلسلہ شروع ہو گیا'- گرفتاریاں عمل میں آنا شروع ہو گئیں -میں ایک لحاظ سے پردہ سکرین سے آؤٹ ہو گیا' پس پردہ رہ کر اپنے مشن کی تکمیل کے لئے حسب سابق جد و جہد میں مشغول رہا-میرے ذمہ تعمیر اور مساوات کے لئے کام کرنا تھا' یہی دو اخبار پیپلز پارٹی کی آواز کو عوام تک پہنچانے کا واحد ذریعہ تھے - چونکہ مقامی قیادت گرفتار تھی لہٰذا ان کی رہائی کی کوشش اخبارات کے پلیٹ فارم سے ہی کی گئی-

ہائیکورٹ کے فیصلے کے خلاف سپریم کورٹ سے جب رجوع کیا گیا تو چند روز بعد ہی حالات معمول کے مطابق ہونا شروع ہو گئے' مختلف قیاس آرائیاں اور افوائیں گردش کرنے لگیں' جد و جہد میں وہ پہلے جیسا تناؤ اب نظر نہ آتا تھا'-

آزاد کشمیر کی سطح پر میں یہ بات پورے دعوی اور یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ مجھے یہ شرف حاصل ہے کہ میں وہ واحد آدمی تھا جس نے سپریم کورٹ کی تمام کاروائی دیکھی اور سنی --- بڑے ہی خستہ حالی تھی' محدود وسائل کی موجودگی میں راولپنڈی جاتا رہا' میر پور کی انتظامیہ اس بات کی از حد خواہشمند تھی کہ کسی طرح اس کو پابند کیا جائے کاروائی کے ضمن میں میری تصاویر اور بیانات اخبارات میں شائع ہوئے' حکومت پاکستان آزاد گورنمنٹ پر دباؤ ڈالتی کہ اس شخص کو کیونکر اس امر کی اجازت دی جاتی ہے کہ وہ پاکستان آکر مختلف سرگرمیوں میں حصہ لیتا ہے' اگرچہ میں پاکستان میں بھی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لیتا تھا' میں تو ایک صحافی کی

حیثیت سے مساوات' سماج اور تعمیر کے لئے رپورٹنگ کرتا تھا دراصل اس بات کی پریشانی زیادہ تر آزاد حکومت کو تھی کہ ہر قسم کی کاروائی کی تفصیل اخبارات کی زینت بن جاتی تھی جس کی وجہ سے ان کے لئے متعدد مسائل پیدا ہو رہے تھے۔ سپریم کورٹ کی کاروائی سننے کے دوران مجھے اس وقت کے مشہور لیڈروں' حفیظ پیرزادہ یحییٰ بختیار اور دیگر مرکزی رہنماؤں کو قریب سے دیکھنے اور سننے کا موقع ملا۔

بھٹو صاحب نے جب سپریم کورٹ کو کیس دیا تو آئندہ چار روز کے دوران بھٹو کو ان کا اپنا بیان دینے کا حق دیا گیا' ان دنوں بڑی سخت پابندیاں تھیں آرمی نے سخت حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے' میں تو کہوں گا کہ پرندہ بھی پر نہیں مار سکتا تھا' میں نے انتہائی مشکل سے عدالت میں جانے کا اجازت نامہ حاصل کیا' میرا خیال ہے کہ آزاد کشمیر سے یہ کارڈ صرف دو آدمیوں کو جاری ہوا تھا جن میں سے ایک میں تھا۔ یہ کارڈ تو میں نے کیسے حاصل کیا' یہ الگ ایک تفصیلی داستان ہے حالانکہ کئی سرکردہ لوگ اس کوشش میں بری طرح ناکام ہو گئے تھے' ۔ اس قدر مشکلات کے باوجود معلوم ہوا کہ ضرورت سے زیادہ پاس جاری کر دیئے گئے۔ ایسے میں صورتحال یہ تھی کہ جو شخص پہلے اندر پہنچ جاتا وہ تو ٹھیک ہے باقی جو رہ گئے سو رہ گئے۔

میں تو ایک رات قبل ہی راولپنڈی پہنچ گیا'۔ جہاں میرے عزیز دوست اکرام محی الدین تھے وہ پارٹی کے سرگرم رکن بھی رہے ہیں۔ میں اس رات جس کی صبح بھٹو صاحب نے بیان دینا تھا۔ رات ۲ یا ۳ بجے سپریم کورٹ کے باہر جا کر بیٹھ گیا کیونکہ یہ خطرہ تھا کہ شاید پاس ہونے کے باوجود اندر نہ جاسکوں' سب سے پہلے اندر جانے والے آدمیوں میں میرا تیسرا یا چوتھا نمبر تھا لیکن میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ عدالت میں تیس سے چالیس کی تعداد میں افراد پہلے سے براجمان ہیں۔

یہ لوگ یقیناً خفیہ ایجنسیوں سے متعلق ہوئے تھے اس کا اندازہ ایک مرتبہ یوں بھی ہوا' کہ جب بھٹو صاحب اندر آتے تو لوگ احترام سے کھڑے ہو جاتے اور پہلی صف میں بیٹھے ہوئے لوگ ہاتھ بھی ملاتے میں اس روز درمیانی بنچوں پر بیٹھا تھا' میرے دائیں اور بائیں دو دو آدمی بیٹھے تھے میں بھی ہاتھ ملانے کے لئے اٹھا تو میرے دائیں طرف والے شخص نے سرگوشی مگر کرخت لہجہ میں کہا "مسٹر ملنے

کی کوشش نہ کرنا" مجھے عدالت کے احترام میں مجبوراً دوبارہ بیٹھنا پڑا' لیکن مجھے بھٹو صاحب کے دورہ آزاد کشمیر کے دوران ان سے ہاتھ ملانے کا اعزاز پہلے حاصل ہو چکا تھا'- دوران کاروائی میں نے دیکھا وہ خاصے کمزور اور لاغر ہو چکے تھے'-

8
فیصلے کا انتظار

ملکی حالات بڑے مخدوش تھے عدالتی فیصلے کا انتظار تھا کیا ہونے والا ہے ؟لیکن یہ توقع کسی کو قطعی نہ تھی کہ بھٹو صاحب کو پھانسی کا حکم دیا جائے گا' یہ وہ وقت تھا کہ جب میرا خیال ہے کہ حفیظ پیر زادہ 'غلام مصطفے جتوئی 'ممتاز بھٹو 'جو خاصے اثر و رسوخ کے مالک تھے 'اگر پارٹی کو منظم کرتے لوگوں کو سڑکوں پر لے کر آتے تو بھٹو صاحب کو بچایا جا سکتا تھا' میں ذاتی طور پر سمجھتا ہوں کہ انہوں نے بھٹو کو بچانے کے لئے کچھ نہیں کیا اس دوران ایک مرتبہ مجھے اسلام آباد میں حفیظ پیر زادہ کے گھر جانے کا اتفاق ہوا ' آزاد کشمیر پیپلز پارٹی کے رہنما ممتاز راٹھور بھی میرے ہمراہ تھے حفیظ پیر زادہ کو ہم نے تجویز دی کہ کوئی تحریک چلائی جائے تو انہوں نے برجستہ جواب دیا کہ ابھی وقت نہیں آیا جب وقت آئے گا تو ہم عوام کو کال کریں گے ہم حیران تھے کہ آخر وہ کون سا وقت ہو گا جو ان رہنماؤں کے نزدیک مناسب ہو گا' اور پھر وقت گزرتا چلا گیا' میرے خیال میں اس پر یہ کہا جانا چاہیئے کہ ان عناصر نے بھٹو صاحب کو تختہ دار پر چڑھانے میں اہم کردار ادا کیا ہے - کیونکہ اگر وہ مخلص ہوتے تو بھٹو کے جانثار ضرور باہر آجاتے 'لیکن افسوس کہ انہیں راہ دکھانے اور منظم کرنے والا کوئی نہیں تھا' قیادت ساری گھروں میں دبکی بیٹھی تھی 'صرف کارکن باقی تھے جو کوڑے کھاتے رہے اور تکلیفیں سہتے رہے -

پاکستان کی طرح آزاد کشمیر میں بھی قیادت کا فقدان کارکنوں کو منظم نہ کر سکنے کا سب سے بڑا سبب ہے 'میں یہ دعوی سے کہہ سکتا ہوں کہ کئی رہنماؤں کو ان کی خواہش کے مطابق جیلوں میں بھیجا گیا تا کہ کارکن ان سے کسی تحریک کے آغاز کا مطالبہ نہ کر سکیں 'پس پردہ کام کرتے ہوئے مجھے چند ماہ گزر چکے تھے 'جنوری ۱۹۷۹ء

بھٹو شہید کیس کے موقع پر سپریم کورٹ کے بار روم میں سابق سنیٹر و زیر راجہ ممتاز، سپیکر اسمبلی کرنل محمد منشاء، اور دیگر لوگوں کے ہمراہ

یحییٰ بختیار کے ہمراہ سپریم کورٹ کے احاطہ میں

میں ذوالفقار علی بھٹو کی آخری سالگرہ اسلام آباد میں منائی گئی یہ بڑی باوقار اور پر امن تقریب تھی اس میں مجھے شمولیت کا موقع ملا'- میں کبھی راولپنڈی 'لاہور 'جہلم کے درمیان بھٹکتا رہا لیکن میر پور سے کسی نہ کسی ذریعہ سے میں رابطہ کرتا رہا-

9
اگر مجھے قتل کیا گیا

یہ جنوری ۷۹ کی ہی بات ہے کہ مارشل لاء کے وائٹ پیپر کے جواب میں بھٹو صاحب نے ایک کتاب لکھی "اگر مجھے قتل کیا گیا" جس کی اشاعت پر حکومت نے سختی سی پابندی لگادی' اس دوران پیپلز پارٹی کے کچھ لوگوں نے اس کو شائع کرنے کا پروگرام بنایا لیکن بد قسمتی سے پکڑے گئے ایک کو مارشل لاء قوانین کے تحت نو سال اور دوسرے کو گیارہ سال جیل میں گزارنا پڑے'۔ آزاد کشمیر میں بھی نیم مارشل لاء ہی نافذ تھا' بیگم بھٹو نے ممتاز راٹھور سے رابطہ کیا اور حکم دیا کہ کسی طرح یہ کتاب آزاد کشمیر سے شائع کرنے کا بندوبست کیا جائے اور اس مقصد کے لیئے کسی انتہائی قابل اعتماد آدمی پر ہی بھروسہ کیا جائے' ممتاز راٹھور صاحب نے مجھے بلایا اور کہا کہ بیگم صاحبہ کی خواہش ہے کہ کتاب کا خلاصہ جیسے بھی ہو شائع کیا جائے' تو اس سلسلے میں تم کیا کردار ادا کر سکتے ہو' میں نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر فوراً حامی بھر لی' اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ میں اپنے قائد کے لئے کوئی تو کام کر سکوں اور پھر یہ اس عظیم خاتون کا حکم تھا جو نہ صرف ذوالفقار علی بھٹو کی اہلیہ تھیں بلکہ جمہوریت کی بحالی میں کی جانے والی ذاتی کوششوں کے باعث ہمیشہ عظیم رہیں گی'۔

پھر میں ممتاز راٹھور کے ہمراہ بیگم بھٹو کو ملنے اسلام آباد آ گیا' وہ اس وقت غالباً جتوئی ہاؤس سے سامنے نیازی ہاؤس ہی تھا اگر میں بھول نہیں رہا تو اس میں بے نظیر بند تھیں' ہماری بیگم صاحبہ سے ملاقات ہوئی انہوں نے انتہائی رازداری سے ہمیں اس کتاب کا مسودہ لا کر دیا جو ہم نے قمیص کے نیچے چھپا لیا کیونکہ باہر پولیس والے پہرے دار تھے' اس سلسلے میں سب سے بڑا مسئلہ اردو ترجمہ کا تھا' بھٹو صاحب کی انگلش کا مستند ترجمہ کرنے کے لئے کسی مستند ترجمان کی ضرورت تھی اور پھر ایسے

حالات میں جب ہر جانب کڑے پہرے بٹھا دیئے گئے ہوں لیکن یہ حقیقت مجھ پر ان حالات میں پوری طرح آشکارا ہو گئی کہ کسی بھی شخص کے نظریات اور خیالات پر کوئی بھی پہرہ نہیں بٹھایا جا سکتا- بہر حال میر پور میں ایک پروفیسر صاحب سے بات کی خاصے معقول اور قابل آدمی تھے اس کے باوجود انہوں نے لغات کا سہارا لے کر چار ہفتوں میں اس کا ترجمہ کیا' رات ۹ تا ایک بجے تک ہم مصروف رہتے اور پھر جب یہ مرحلہ حل ہوا تو اس سے بھی کٹھن کام کتابت اور اس کی اشاعت کا تھا' پھر ہمارے پاس کوئی محفوظ جگہ بھی نہ تھی جہاں کسی قسم کا کوئی ڈر خطرہ ہو' بہر حال چند قابل اعتماد دوستوں کی رہنمائی اور مدد سے کتابت ہو گئی اس دوران سپریم کورٹ کا فیصلہ آ گیا اپیل مسترد کر دی گئی'- میں ان دنوں انڈر گراؤنڈ کام کر رہا تھا' باہر گرفتاریاں ہو رہی تھیں' پولیس میری تلاش میں چھاپے مار رہی تھی' تا کہ کم از کم پریس سے تو رابطہ کسی طرح ختم ہو سکے' میں چھپتا پھر رہا تھا کبھی جہلم' کبھی لاہور اور کبھی راولپنڈی- اس طرح کتاب کی اشاعت کا معاملہ کٹھائی میں پڑ گیا-

سماج ستمبر 1978ء کے ٹائیٹل کا عکس۔ اس شمارے میں بھٹو کی کتاب ''اگر مجھے قتل کیا گیا'' کو پہلی مرتبہ شائع کیا گیا

10
جب میں گرفتار ہوا

فروری ۱۹۷۹ء میں حالات بہت مخدوش سے نظر آتے تھے' کسی کو مستقبل قریب کا پتہ تھا' جب انسان ہر جانب سے مایوسیوں کے سائے میں گھر جائے تو پھر وہ اپنے آپ کو حالات کے حوالے کر کے خود آنے والے وقت کا انتظار کرتا ہے'۔ فیصلہ چاہے اس کی حق میں ہو یا مخالفت میں' اس کو لبیک کہے بغیر چارہ نہیں' کچھ ایسی ہی صورتحال سے میں یا دوسرے لوگ خصوصاً پیپلز پارٹی سے متعلقہ لوگ دوچار تھے۔

اور پھر اس فیصلے کا اعلان کر دیا گیا'۔ جسے آپ یقیناً غیر متوقع کہیں گے یعنی دنیا حیران رہ گئی کیونکہ سپریم کورٹ نے ہائی کورٹ کے فیصلے کو برقرار رکھا تھا' جیسے کاٹو تو لہو نہیں' ہونقوں کی طرح ہر شخص ایک دوسرے کی جانب دیکھ رہا تھا' اور اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا کہ کیا واقعی؟

میری گرفتاری کے لئے زور شور سے چھاپے مارنے کا سلسلہ ایک مرتبہ پھر شروع ہو گیا'۔ میں ہاتھ نہ آتا تو گھر والوں سے بلاوجہ بازپرس کی جاتی انہیں تنگ کیا جاتا اور میری کسی بھی "خفیہ ٹھکانے کا پتہ بتانے کی ہدایت کی جاتی

لیکن ان کے پاس تو حسب سابق ایک ہی جواب تھا کہ "وہ تو یہاں رہتا ہی نہیں"۔ میں بہرحال کسی نہ کسی طور میر پور سے رابطہ رکھتا تھا' پھر آہستہ آہستہ حالات اس قدر مخالف ہوتے چلے گئے کہ مجھے کوئی راہ فرار دکھائی ہی نہ دیتی تھی' ایک روز میں نے جب سوچا کہ آخر اس طرح کب تک؟ اور پھر یکدم فیصلہ کیا کہ میں اپنے آپ کو گرفتاری کے لئے پیش کر دوں گا اس رات میں میر پور واپس آ گیا' لیکن کسی کو میرے آنے کی خبر نہ تھی' خفیہ ٹھکانے پر شب بسر کی۔ دوسرے روز میر پور میں عدالت عالیہ کے فیصلے کے خلاف پہیہ جام ہڑتال تھی۔ بہت بڑے جلوس کا بندوبست کیا

گیا تھا- یہ جلوس میر پور میں چوک شہیداں سے شروع ہوا' جس نے شہر کا چکر لگا کر ایک جلسہ عام کی شکل اختیار کرنا تھی میں صبح ۱۰ بجے رکشے میں بیٹھا' اور سی ایم ایچ کے پاس سے گزرتے ہوئے جلوس میں آن ملا' تمام کارکن اور رہنما دنگ رہ گئے'- کئی مرکزی رہنماؤں نے مجھے ڈانٹا اور کہا کہ اب پریس کا جو واحد ذریعہ باقی رہ گیا تھا وہ بھی جاتا رہا- کیونکہ ان کی ذاتی تشہیر کا دروازہ ان کے خیال میں بند ہو چکا تھا- لیکن مجھے دکھ احساس کا ضرور ہوا کہ کسی نے مجھ سے یہ استفسار نہیں کیا کہ آخر تم کس حال میں ہو' پولیس نے مجھے کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھنا شروع کر دیا وہ اس تاڑ میں تھے کہ موقع ملتے ہی اس کو دبوچ لیں گے' جلوس جس وقت چکر لگانے کے بعد جلسے میں تبدیل ہوا - تو مجھے سٹیج سیکرٹری کے فرائض سنبھالنا پڑے' جس کے اختتام پر اعلان کیا گیا کہ دفتر میں عہدیداران کا ایک اہم اجلاس منعقد ہو گا-

پھر جونہی میرے قدم زمیں پر لگے یعنی میں سٹیج سے نیچے اترا تو بھرے مجمع سے مجھے پولیس نے اٹھایا اور جیپ میں پٹخ دیا' جلسہ میں کئی سابق وزراء مشیر اور مرکزی رہنماء بھی تھے لیکن کسی کو یہ جسارت نہ ہوئی کہ وہ میری گرفتاری پر پولیس سے استفسار ہی کر لیں' شام کو کچھ مزید لوگوں کو گرفتار کیا گیا- حوالات میں بند آنیوالے حالات پر غور کرنے لگا' کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا' ہر چھ گھنٹے کے بعد میرے بیانات لئے جاتے-

حالانکہ تمام پولیس اہلکار میرے بارے میں بخوبی واقف تھے لیکن شاید تفتیش کرنا ہی تو ان کا اصل کام ہے- اصولاً تو مجھے بھی دیگر ایسے افراد کے ہمراہ جیل بھیجا جانا چاہیے تھا جن پر کیس بنا کر جیل بھیج دیا گیا' لیکن میں مسلسل پولیس کی حراست میں تھا' بظاہر تو اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی لیکن قیاس یہی تھا کہ مجھے کسی ایسے مقدمے میں پھنسانے کا منصوبہ بن رہا ہے کہ طویل عرصہ تک میں باہر نہ آسکوں تبھی تو مجھے دھمکیاں دی جا رہی تھیں کہ تم پر سیاسی نہیں بلکہ اخلاقی جرائم کے کیس عائد کئے جائیں گے' میرے جو ساتھی جیل میں بند تھے ان کا موقف یہ تھا کہ ایک سیاسی قیدی کو حوالات میں رکھنا قانون کی خلاف ورزی ہے لہٰذا اسے جیل جتنی جلد ممکن ہو منتقل کیا جائے - بہر حال اسی دوران ارشد برقی ہمایوں پاشا نے انتظامیہ کے خلاف بھوک

ہڑتال کر دی اس موقع پر کئی مرکزی عہدیداروں نے خفگی کا اظہار کیا اور برملا کہا کہ بھوک ہڑتال کی کوئی ضرورت نہیں ایک دو رہنماؤں کی یہ حالت ہو چلی تھی کہ کوئی کارکن دوسرے کارکن کے حق میں کوئی بات تک کہہ دیتا تو اسے بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا'

مجھے میرا چھوٹا بھائی طیب کمال پاشا حوالات میں کھانا وغیرہ دینے آتا' میں نے اس کے ہاتھ کاغذ پنسل منگوا لی' سلاخوں سے بیرونی بلب کی روشنی چھن کر اندر آتی تھی میں کرنوں کا بھرپور استعمال کر رہا تھا' اسی روشنی میں خبریں بناتا اور کھانا لانے والوں کے ہاتھ وہ خبریں پھر اخبارات کے دفاتی تک پہنچ جاتیں'۔ انتظامیہ کو پریشانی لاحق تھی کہ ایک شخص قید ہے اور خبروں کی اشاعت چہ معنی دارد!۔

خبروں کی تعمیر میں کھانا لانے والے سے معلوم ہونے والے حالات حاضرہ کی روشنی میں کرتا ایک روز میرا چھوٹا بھائی طیب کمال پاشا آیا اس کو میں نے پہلے سے تیار خبریں تھما دیں اور مختصراً اشاروں کنایوں سے سمجھا دیا کہ یہ فلاں شخص کو دے دیں' روزنامہ تعمیر اور مساوات میں شائع ہو جائیں گی وہ خبریں لے کر چلا گیا' میں مطمئن ہو کر زمین پر دراز ہو گیا' رات کو ایک اے ایس آئی ایک سب انسپکٹر' مقامی انتظامیہ کے چند افراد اور کچھ کانسٹیبلوں نے مجھے اچانک آ کر جھنجھوڑا' اور انتہائی درشت لہجے میں کہا کہ تم ہماری نرمی سے ناجائز اٹھا رہے ہو' کیا تم ہماری تبدیلی Transfer کرنا چاہتے ہو' اور پھر میرا بستر جو فرش پر بچھا تھا اس کی تلاش شروع کر دی میری سمجھ میں اب تک کچھ نہیں آیا کہ آخر یہ معاملہ کیا ہے؟ دوران تلاشی سرہانے کے کونے سے پنسل اور کاغذ جب برآمد کئے گئے تو پھر میں سمجھا کہ یہ سب کیا ہے؟

11
ملاقات پر پابندی

پھر تو میری ملاقات پر بھی پابندی عائد کر دی گئی' گھر یا دوستوں کی جانب سے آنیوالا کھانا بھی اب باقاعدہ چیک ہونا شروع ہو گیا'- باہر طلباء بھی یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ طاہر کو رہا کیا جائے- لیکن یہاں کیا تھا کہ مجھے پانچ یا سات دن کے بعد مجسٹریٹ کے گھر لے جاتے' اور مزید ریمانڈ لے کر واپس لے آتے' ان کا یہ سوال میں روز سن سن کر اکتا چکا تھا کہ تمہیں سپورٹ کون کرتا ہے؟ کون پیسہ فراہم کر رہا ہے؟ یہ دراصل پولیس کی تفتیش کا طریقہ کار ہے- پھر ایک روز مجھے جیل منتقل کر دیا گیا 'جہاں کی حالات کم از کم حوالات سے قدرے بہتر تھی'---

یہاں آ کر مجھ پر ایک نیا انکشاف یہ ہوا کہ میں نے جو خبر حوالات سے اپنے بھائی کو دی تھی وہ اس نے میر پور کے ایک "ابھرتے ہوئے" صحافی اور پی پی کے ایک نام نہاد رہنماء کے حوالے کر دی' جس نے انہیں اخباروں کے دفاتر پہنچانے کی بجائے مقامی انتظامیہ کے اعلیٰ عہدیداران کی "خدمت" میں پیش کر دیا' البتہ اس سے یہ ہوا کہ میں حوالات کی اذیت سے بچ کر جیل آ پہنچا' لیکن میری وہ کاوشیں وقتی طور پر معطل ہو گئیں جو میں خبروں کی صورت میں حوالات سے کر رہا تھا فروری کے آخر میں میری ضمانت ہو گئی لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا یا انتظامیہ کو گوارا تھا کہ میں باہر رہ کر ان کے لئے دردسر بنوں' لہٰذا فوراً ہی مجھے ایک دوسرے کیس میں جیل بھیج دیا گیا' اس وقت آزاد کشمیر پیپلز پارٹی کے چند اہم رہنما راجہ ممتاز راٹھور' شیخ منظر مسعود پیر علی جان شاہ مہر خالد بشیر- میر عبدالرحمن مرحوم' چوہدری عبداللہ مرحوم اور شیخ ارشد برقی پی ایس ایف کے سابق چیئرمین جو اس وقت برطانیہ میں جلاوطنی کی زندگی گزار رہے ہیں وغیرہ بھی جیل میں "سرکاری مہمان" تھے- دوسرے کیس میں جیل جانے

کے دو ہفتوں بعد ہی آزاد کشمیر ہائی کورٹ سے ضمانت پر رہا ہوا' اور فوراً ہی ایک نئے کیس کے ہمراہ دوبارہ جیل جا بیٹھا رہائی والے دن ہی گرفتار کرتے اور تاریخ اس سے اگلے دن کی درج کی جاتی۔

کیا کیا نہ ہمیں لالچ دیئے گئے' کئی دیگر لوگ خاموشی اختیار کئے ہوئے تھے ہم تھے درویش منش' نہ کوئی مفاد تھا اور نہ ہی کسی جائیداد یا دولت کا تحفظ مقصود تھا مارچ کا مہینہ خاصی کشمکش میں گذرا' خوف وہراس کا عالم تھا' یکم اپریل ۱۹۷۹ کو میری دوبارہ ضمانت ہوئی'۔ ابھی میں جیل میں ہی تھا کہ اس وقت ایک دوسرے کارکن خواجہ عبدالعزیز کی ضمانت ہوئی جب کہ ایک اور شخص کا نام مجھے یاد نہیں رہا جیل کے بڑے دروازے سے باہر جھانکا تو پولیس کی بھاری نفری موجود تھی ضمانت کا وقت گیارہ یا بارہ بجے دوپہر تھا' اس دوران معلوم ہو گیا کہ دوبارہ دھر لئے جائیں گے' البتہ دوستوں نے مشورہ دیا کہ موقع ملتے ہی بھاگ نکلو تاکہ پریس سے منقطع ہونے والا رابطہ تو بحال ہو سکے' اس طرح آزاد کشمیر میں چلنے والی تحریک کا کچھ اثر پاکستان میں بھی محسوس کیا جائے'۔

12
پولیس کا تشدد

میں نے اپنے آپ کو ذہنی طور پر تیار کر لیا کہ کس طرح مجھے راہ فرار اختیار کرنا ہے بن خرماں کی جیل پہاڑی علاقہ میں واقع ہے اونچی نیچی گھاٹیاں اور جھاڑیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی دکھائی دیتی ہیں

چونکہ پروگرام جیل کے اندر ہی ترتیب دے رکھا تھا لہٰذا جونہی مین گیٹ پر آئے تو ایک شخص دائیں' دوسرا بائیں اور تیسرا ناک کی سیدھ میں دیوانہ وار دوڑ پڑا' میں بائیں جانب بھاگ رہا تھا چونکہ ان کا حدف تو میں تھا لہٰذا وہ مجھے آوازیں دینے لگے' یہ بات ان کے لئے قطعی خلاف توقع تھی میں دوڑتا ہوا' بن خرماں کے دیہاتوں کی جانب جا نکلا میرے پیچھے آنے والا انسپکٹر دوڑنے کے دوران ایک گہرے کھڈ میں جا گرا باقی پولیس والے نہ صرف منہ دیکھتے رہ گئے بلکہ وہ سخت شرمندہ بھی ہوئے۔ جیل حکام نے بھی غالباً انتظامیہ کو اس واقعہ سے فوری طور پر آگاہ کر دیا تھا' میں بھاگتے ہوئے دیہات میں واقع ایک گھر میں گھس گیا'۔ گھر میں موجود بڑھیا کو ہاتھ کے اشارے سے خاموش رہنے کی ہدایت کی اور چارپائی کے نیچے جا گھسا اس تمام عرصہ میں انتظامیہ کی جانب سے تقریباً چالیس آدمی مزید بھیج دیئے گئے'

کیونکہ ان کی نظر میں سات آٹھ کانسٹیبل اور انسپکٹر مل کر ایک نوجوان کو گرفتار نہ کر سکے تھے لہٰذا مزید آدمیوں کو بھیج کر گاؤں کا مکمل گھیراؤ کرا لیا گیا اور گاؤں کے لوگوں کو یہ باور کرایا کہ ایک خطرناک مجرم جیل سے بھاگ کر آ گیا ہے اسے کوئی اپنے ہاں پناہ نہ دے ورنہ اس کا بھی برا حشر ہو گا تمام کوششوں میں ناکامی کے بعد فیصلہ کیا گیا کہ ایک ایک گھر کی تلاشی لی جائے بالآخر وہی ہوا جس کا ڈر تھا میں جس گھر میں چھپا بیٹھا تھا وہ اس مکان میں آدھمکے پاؤں کی آہٹ صاف سنائی دے

رہی تھی گھر کی بوڑھی مالکن سے پولیس نے استفسار کیا کہ یہاں کوئی شخص چھپا ہوا تو نہیں اس نے اس کا جواب نفی میں دیا' میں جس کمرہ میں چھپا تھا اس کا دروازہ سامنے کی جانب کھلتا تھا اس وجہ سے شاید ان کو میری چپل نظر آ گئی

لیکن انہوں نے یہی تاثر دیا کہ انہیں کسی کے یہاں ہونے یا نہ ہونے کا کوئی علم نہیں کیونکہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ مبادا کہیں بھاگ نہ جائے بہر حال انہوں نے پلاننگ کی اور مجھے فرار ہونے کا موقع نہیں دیا باہر نکالا رسیوں سے باندھا اور اس گھر والوں کو ننگی گالیاں دیتے ہوئے باہر آئے اور مجھ پر تشدد شروع کر دیا' میرے چاروں جانب پولیس والے موجود تھے' اور پھر مجھ پر' تھپڑوں' مکوں' اور لاتوں کی بارش کر دی گئی' جو جس طرح چاہتا مجھے پیٹتا اور گالیوں سے نواز رہا تھا' ان کا موقف تھا کہ "تم اتنے بڑے لیڈر بن گئے ہو آج تمہاری سیاست ہم درست کر دیں گے' تشدد کرتے ہوئے وہ مجھے مین روڈ تک لے آئے' لوگوں کو تو بعد میں اس بات کا علم ہوا کہ یہ خطرناک مجرم نہیں بلکہ سیاسی آدمی ہے۔ علاقے میں پولیس کے اس سر عام تشدد سے زبردست خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا' غریب لوگ مجبوری کے باعث خاموش تھے' مجھے مارتے ہوئے ہی جیپ میں ڈالا' اور میر پور تھانے میں لا کر دوبارہ تشدد کا آغاز ہو گیا۔ میر پور کے لاتعداد عوام تھانے کے باہر اندر سے آنے والی دردناک چیخوں کی آواز کو با آسانی سن سکتے تھے'۔ مجھے انہوں نے فٹ بال بنا رکھا تھا۔

شام کو ذرا ہوش آیا تو دیکھا کہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اور میں کمرے کے ایک کونے میں پڑا ہوا ہوں سب انسپکٹر چوہدری سعید' اور ایس ایچ او راجہ نسیم نے مجھ پر تشدد کی انتہا کر دی تھی ہوش آنے پر انہوں نے کہا کہ اس کاغذ پر دستخط کر دو' ہم تمہیں گھر بھیج دیں گے' کیونکہ وہ اب اپنی جان چھڑانا چاہتے تھے'۔ لیکن میں اس بات کو کیونکر تسلیم کر سکتا تھا لہٰذا میں نے تو صاف انکار کر دیا البتہ میری یہ خواہش تھی کہ اس حوالات کی بجائے مجھے جیل بھیج دیا جائے رات کو مجھے انتہائی سخت جسمانی تکلیف محسوس ہوتی رہی کیونکہ مجھ پر بے انتہا تشدد کیا گیا تھا رات کے پچھلے پہر میرے پاس ایس پی آیا اور میرے بیان وغیرہ لئے اب میں اس شش و پنج میں تھا کہ اگر ان کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس کو بہت زیادہ لگی ہے تو کہیں یہ

مجھے قید تنہائی میں ہی نہ رکھیں اور جیل منتقل نہ کرنے کا کوئی عذر تراش لیں - لہٰذا میں نے کہا میں تو اپنے آپ کو نارمل خیال کرتا ہوں---اور پھر دوسرے دن صبح سولہ ایم پی او کے تحت مجھے نظر بند کر کے دوبارہ ڈسٹرکٹ جیل بھیج دیا گیا'- میری ابتر حالت کو دیکھ کر جیل میں دوسرے لوگوں نے احتجاج کیا کہ اس کا میڈیکل چیک اپ کرایا جائے ایک افراتفری کا عالم پیدا ہو گیا جیل سپرنٹنڈنٹ نے ڈپٹی کمشنر سے رابطہ کیا' وہ بھی پریشان انہوں نے کہا کہ اسے تو معمولی سی مار دی گئی ہے ہیلتھ آفیسر کو بلایا گیا' میں نے قمیض پہن رکھی تھی وہ میرے جسم سے چمٹ گئی تھی جسے مشکل سے اتارا گیا- معائنہ ہوا' رپورٹ تیار ہوئی جس میں ڈاکٹر نے پر زور سفارش کی کہ اسے فی الفور ہسپتال منتقل کیا جائے سپرنٹنڈنٹ جیل نے اس پر یہ کہہ کر مجھے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ " اس حالت میں میں اس کو جیل میں نہیں رکھ سکتا آخر کار انتظامیہ نے فیصلہ کیا کہ مجھے کمبائنڈ ملٹری ہسپتال منتقل کر دیا جائے اس موقع پر ہمارے لیڈروں راجہ ممتاز راٹھور' شیخ منظر مسعود' پیر علی جان شاہ' میر خالد بشیر' شیخ ارشد برقی خصوصاً چوہدری نور حسین کا بھی بہت دباؤ تھا انہوں نے انتظامیہ کے خلاف زبردست احتجاج کیا تھا-

پھر مجھے ملٹری پولیس کی کڑی نگرانی میں نہ صرف ہسپتال منتقل کر دیا گیا بلکہ جس کمرے میں مجھے داخل کیا گیا اسے انتظامیہ نے سب جیل قرار دے دیا یہ واقعہ ۲ اپریل ۱۹۷۹ کا ہے میں نے تین اپریل کو انتظامیہ کے چند افسران کے خلاف کیس درج کرایا کہ انہوں نے بلاوجہ مجھ پر قاتلانہ حملہ کیا ہے اس پر تو سارے شہر میں عجیب سی فضا پیدا ہو گئی' انتظامیہ والے سوچنے لگے کہ اس نے تو یہ کہا تھا کہ مجھ پر کوئی تشدد نہیں ہوا اور میں بالکل نارمل ہوں لیکن اب تو معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا تھا' کیونکہ میں نے یہاں بھی سیاست سے کام لیا تھا میں اگر یہ ڈرامہ نہ کرتا تو میں ان کے حراست سے نہ نکل سکتا اور نہ بروقت میرا علاج ممکن تھا-

13
منحوس سحر

اور پھر اس زمانے نے وہ منحوس سحر طلوع ہوتے دیکھی جو رہتی دنیا تک کے لئے اپنی سیاہی کے انمٹ نقش چھوڑ گئی ہے یہ دن تھا ۴ اپریل ۱۹۷۹ کا- جب مجھے یہ منحوس خبر سننے کو ملی کہ قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی دے دی گئی- مجھے کچھ ہوش نہ رہا حالانکہ میرا جسم زخموں سے بالکل چور تھا میڈیکل رپورٹ میں ۳۶ زخم دکھائے گئے تھے جن میں سے بعض کی گہرائی ۱۵ انچ تک تھی-

اس طرح یہ بات ریکارڈ پر ہے کہ آزاد کشمیر سے میں واحد آدمی تھا جسے پیپلز پارٹی اور قائد عوام جناب ذوالفقار علی بھٹو سے والہانہ محبت کی پاداش میں اس قدر شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا-

میں تو ایک لحاظ سے بستر مرگ پر دراز تھا' دو پولیس کانسٹیبل باہر پہرے پر تھے' اتنے میں غالباً نو بجے کی خبروں کی آواز آئی اور پھر میں نے ان پولیس والوں کو جناب بھٹو کی پھانسی سے متعلق کوئی گفتگو کرتے ہوئے سنا میں نے بمشکل انہیں آواز دی' پولیس والا آیا اور اس سے استفسار کیا- اس کا جو جواب تھا وہ میرے ہی نہیں ساری قوم کے حواس شل کر دینے کے لئے کافی تھا اس نے بتایا کہ ذوالفقار علی بھٹو کو پھانسی کے فوراً بعد دفنا بھی دیا گیا ہے ---------- میرے آنسو نکل آئے - اور ہمت جواب دے گئی جس مشن کے لئے ہم سرگرم عمل تھے اس کا وجود ہی مٹ گیا تھا سوچا بھاگ جاؤں' پھر یہی خیال آیا کہ کہاں جاؤں گا' تین ہفتے مسلسل ہسپتال میں رہا چند روز تک کبھی کبھار کہیں سے احتجاج کی صدا بلند ہوتی اور پھر گہری خاموشی چھا جاتی حالت ذرا بہتر ہونے پر مجھے ہسپتال سے دوبارہ جیل بھیج دیا گیا میں غالباً آخری سیاسی قیدی تھا جو جیل میں مقید تھا باقی تقریباً تمام قیدی رہا ہو چکے تھے آخر کار اپریل کے اختتام

پر مجھے رہا کر دیا گیا

مئی ۱۹۷۹ء میں میں نے سماج کا ایڈیشن نکالا' جس میں جنرل ضیاء کا بھیانک کارٹون شائع کیا' یہ میں نے مساوات لندن سے لفٹ کیا تھا جو لندن کے دوستوں کے توسط سے مجھ تک پہنچا تھا میں ایک مرتبہ پھر پس پردہ چلا گیا' سب لوگ ہی جمہوریت کی بحالی چاہتے تھے لیکن جنرل ضیاء کا اس ضمن میں کوئی مثبت ارادہ سامنے نہ آیا وہ ایک ایسے جال میں پھنس چکا تھا جس سے وہ نکل نہ سکتا تھا- میں نے ایک مرتبہ پھر بھٹو کی کتاب کی اشاعت کا کام شروع کر دیا جون میں کراچی چلا گیا اس مرتبہ پھر ایک بار بے نظیر بھٹو سے کراچی میں ملاقات کا شرف حاصل ہوا - حالات خاصے مخدوش ہو چکے تھے جناب بھٹو کو پھانسی سے قبل یہ تاثر بھی دیا جاتا رہا کہ یہ سب نورا کشتی ہے لیکن اب تو سب کچھ واضح ہو چکا تھا خوف و ہراس کی ایسی فضا تھی کہ کوئی شخص پر مارنے کی جرات نہ کرتا' لیکن یہ تاریخ کا عمل ہے کہ ایسے حالات میں بھی ہمیشہ کی طرح اس مرتبہ بھی ایسے کارکنوں کی کمی نہ تھی جو اپنے موقف کے لئے کچھ بھی کر سکتے تھے- اسی لئے تو کئی جوشیلے کارکنوں نے خود سوزی بھی کی' گھر بار لٹا دیئے- یہ سب کچھ آخر بھٹو کی شخصیت کے لئے ہی تو تھا کیونکہ انہوں نے بھی عوام کی خاطر اپنی جان تک لٹا دی تھی-

14
اپنوں کی بے رخی

بھٹو صاحب کی کتاب کی اشاعت مکمل کرنے کے سلسلے میں میں نے لاہور میں موجود با اعتماد دوستوں سے مشورہ کیا' اور ایک پریس والے کو انتہائی مشکل سے راضی کیا- میں نے اس بات کا ذمہ لیا کہ چاہے کچھ ہو جائے اس کا نام میرے ہونٹوں سے باہر نہ آئے گا اگست میں پرنٹنگ کے کام کو شروع کرنے کا پروگرام بنا لیکن یہ بات آڑے آ رہی تھی کہ اگر میں بغیر نام کے پمفلٹ کے طور پر شائع کرتا تو اس کا کریڈٹ نام نہاد راہنماؤں نے لے لینا تھا اور اگر وہ پکڑے جاتے تو مجھے آگے کر دیتے میرے حالات بھی اس قدر خراب ہو چکے تھے کہ میں یہ بات سوچنے پر مجبور ہو گیا کہ کیوں نا سیاست کو بالکل خیر باد کہہ دوں واپسی کا بھی کوئی راستہ نہ تھا گھر سے مکمل جواب مل چکا تھا سیاسی طور پر کوئی مدد کرنے کو تیار نہ تھا تعلیمی میدان بھی ہاتھ سے نکل چکا تھا کہ دوبارہ تعلیم کو ہی مکمل کر سکوں- اسی شش و پنج میں دن گذر رہے تھے۔ زبانی طور پر لوگوں کی حمایت حاصل بھی ہو جاتی تھی لیکن عملی طور پر سب ہی کنی کتراتے پھر ایسا بھی ہوا کہ بھٹو صاحب کی کتاب کا ترجمہ سماج میں شائع کرنے کا پروگرام بنا تو مرکزی رہنما جن کا نام میں نہیں لینا چاہتا- انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس تو ایک پائی نہیں- اس صورتحال پر بڑا افسوس ہوا' کہ ہم تو اس وقت پارٹی میں شامل ہوئے ہیں جب پارٹی زوال میں گھر چکی تھی اور یہ لوگ جو پارٹی کے سرپرو زیر اور مشیر رہے ہیں اب پارٹی یا اس کے قائد کی خاطر کسی قسم کی امداد کرنے سے انکاری تھے-

سوائے افسوس کے اس صورتحال پر مجھ جیسا ناچیز اور کیا کر سکتا تھا- دل کڑھتا تھا - اور ذہن سوچتا تھا کہ کیا گردش زمانہ انسان سے اس کے جذبات' احساسات'

ہمدردیاں ' نظریات اور اصول یوں بھی چھین لیتی ہے یا یہ انسان کی اپنی صوابدید پر منحصر ہے کہ وہ اپنے آپ کو وقت کے ساتھ ساتھ یوں تبدیل کرتا چلا جائے میں انہی سوچوں میں غرق اپنی صورتحال پر ازسر نو غور کرتا رہا کہ کیا میں کسی فاش غلطی یا بیوقوفی کا مرتکب تو نہیں ہو رہا- ایسے میں بغور مشاہدے نے مجھ پر یہ بات پوری طرح عیاں کر دی تھی کہ ایک کارکن اور "لیڈر" میں بہرحال کچھ فرق ضرور ہوتا ہے- کارکن لکیر کا فقیر ہوتا ہے -جو اول تا آخر اپنے عقیدے یا نظریے پر نظر ثانی کی زحمت گوارہ کرتا ہے اور نہ ہی اس ضمن میں کوئی "مفید" مشورہ اسے اس کے موقف سے ہٹا سکتا ہے کچھ ایسے ہی کارکنوں کی حمایت مجھے اس تکلیف دہ صورتحال کے دوران میسر آ گئی اور میں اس قابل ہو گیا کہ 'چار ہزار پمفلٹ یعنی "سماج" کا شمارہ شائع کر سکوں ' جس میں بھٹو صاحب کی کتاب کا ترجمہ شامل تھا- پرنٹنگ کا مسئلہ تو حل ہو گیا لیکن اس وقت ایک دوسرے مسئلے نے سر ابھارا جس پر سچی بات ہے کہ ہم نے پہلے غور ہی نہیں کیا تھا وہ مسئلہ یہ تھا کہ اس شمارے کو فروخت کیسے کیا جائے کیونکہ کوئی شخص یہ مصیبت مول لینے کو تیار نہ تھا- ایک مرتبہ پھر مجھے پارٹی کے سرکردہ لوگوں سے رابطہ کے لئے مجبور ہونا پڑا کیونکہ میگزین کو ہر صورت لوگوں تک پہنچانا تھا- یہ خطرہ بھی لاحق تھا کہ اس مرتبہ اگر میں گرفتار ہو گیا تو پہلے سے کہیں زیادہ سخت تشدد کا سامنا کرنا پڑے گا' جس کا نہ مجھے اور نہ ہی پارٹی کو کوئی فائدہ ہو گا- یہ ایسا موقع تھا جب میں نے ملک سے باہر چلے جانے کا فیصلہ کر لیا-

15
ملک سے فرار

پھر وہ میگزین میں نے میر پور میں چند مخلص دوستوں کو دینے کے علاوہ راولپنڈی میں یحییٰ بختیار' پشاور میں آفتاب شیر پاؤ' کو دیے - اس طرح مختلف ذرائع سے پرچہ تقسیم کرنے کا بندوبست کر لیا گیا' لیکن اس شرط پر کہ آٹھ دس روز کے بعد تقسیم کیا جائے گا - میں فی الوقت افغانستان یا کسی دوسرے ملک چلا جاؤں اور جب حالات بہتر ہو جائیں گے تو واپس آ جاؤں - لیکن باہر کیسے جاؤں - یہی تو ایک بڑا مسئلہ تھا۔

پارٹی کے عہدیداروں سے اس سلسلے میں کوئی توقع نہ تھی - میں نے اپنی والدہ سے بات کی شاید انہوں نے یہ سوچ کر کہ یہ کسی طرح باہر نکل جائے تو یہاں کے مصائب سے چھٹکارا حاصل کرے گا' ہمارے ایک ہمسائے سے سات ہزار روپیہ ادھار لے کر مجھے دے دیا - یہ اس وقت کی بات ہے جب افغانستان میں سردار داؤد کی حکومت کا تختہ الٹا گیا تھا' نور محمد ترکئی حکمران تھا' خاصی غیر یقینی صورتحال تھی بہر حال میں کسی پروگرام کے بغیر چل پڑا - میر پور سے لاہور آیا اور پھر وہاں چند دوستوں کو مل کر راولپنڈی اور پھر پشاور ---------

اس سے قبل جب مجھے جیل سے رہا کیا گیا تو انتظامیہ کو فکر لاحق تھی کہ اس نے توہم پر ہائیکورٹ میں کیس کر رکھا ہے - مجھے اس ضمن میں کیس واپس لے لینے کی دھمکیاں مل رہی تھیں - جب انہوں نے یہ دیکھا کہ یہ دباؤ میں نہیں آیا تو انہوں نے مجھ پر جھوٹا کیس بنوا دیا کہ اس نے ایس ایچ او پر حملہ کیا ہے - میرے جو گواہ تھے ان کو بھی ڈرایا گیا - تاکہ وہ گواہی نہ دیں' چونکہ مارشل لاء کا دور تھا کوئی بھی غیر سیاسی شخص ان جھمیلوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا میرے ملک سے باہر چلے جانے پر آخر کار مجھے اشتہاری مجرم قرار دے دیا گیا - لیکن اس کے باوجود میگزین کے منظر عام پر آنے کے

باعث ان کا خیال تھا کہ شاید میں یہیں کہیں چھپا ہوا ہوں اسی لئے تو میرے عارضی آفس کے علاوہ دیگر کئی جگہوں پر چھاپے مارے گئے۔

چونکہ میں نے بمشکل تمام افغانستان' اٹلی' ترکی' یوگوسلاویہ اور بلغاریہ کا ویزہ لے لیا لیکن منزل کا کوئی پتہ نہ تھا لندن میں ایک جاننے والے صحافی دوست ظفر تنویر تھے' انہیں خط لکھا انہوں نے جواباً لکھا کہ تم کسی طرح فرانس' جرمنی وغیرہ آجاؤ یہاں سیاسی پناہ مل جائے گی' ۷ ستمبر ۷۹ء تھا رات بارہ بجے میں راولپنڈی سے بس میں بیٹھا اور پشاور آ گیا۔ یہاں سے کابل کے لئے بسیں جاتی تھیں۔ اگرچہ حالات بہت خراب تھے لیکن جو صورتحال آجکل ہے ایسی نہ تھی' ٹکٹ لیا اور کابل جانے کے لئے بس میں سوار ہو گیا۔

16
کابل کی گلیاں

یہ میری زندگی کا پہلا موقع تھا کہ میں کسی غیر ملک جا رہا تھا اور وہ بھی انتہائی کسمپرسی اور بے سروسامانی کے عالم میں' دل و دماغ عجیب کشمکش کا شکار تھے' کچھ سمجھ نہ آتی تھی کہ مستقبل نہیں بلکہ مستقبل قریب میں کیا ہو گا- انہی خیالات میں غلطاں و پیچاں جلال آباد آ گیا' یہاں میں نے کھانا کھایا' جہاں سے دوبارہ کابل کے لئے بس میں بیٹھا تو ایک ہم وطن میرا ہم سفر بن گیا- وہ نوجوان لاہور کا رہنے والا تھا' اس ہمراہی کے ساتھ تبادلہ خیال میں وقت اچھا گذر گیا کابل پہنچنے پر فکر لاحق ہوئی کہ اب جانا کہاں ہے- پھر ہم پاکستانی سفارتخانہ کے بالکل قریب ایک ہوٹل میں کمرہ کرائے پر لے لیا اب ایک نئی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا' آئے روز نت نئی خبریں سننے کو ملتی تھیں' میں نے کئی مرتبہ سوچا کہ خط لکھوں لیکن یہ سن کر مایوسی ہوئی کہ ہر پاکستانی کا خط سنسر کیا جاتا ہے- اور کسی قسم کی قابل اعتراض بات اگر تحریر کی گئی ہو تو سخت سزا کے لئے تیار رہنا پڑتا ہے' اور ویسے بھی معمول کے مطابق کئی ہفتوں کے بعد خط منزل مقصود پر پہنچ پاتا تھا- ایسے میں میں نے ایک ترکیب نکالی- خط لکھا اور پشاور جانیوالی بس کے ایک ڈرائیور سے بات کی کہ تم یہ خط پشاور سے جا کر پوسٹ کر دو' اچھا آدمی تھا' اس نے حامی بھر لی-

کابل میں دن بھر سوائے آوارہ گردی کے کوئی کام نہ تھا' حالات خاصے کشیدہ تھے' یہی سوچ ہر وقت ذہن پر سوار رہتی کہ آگے کی طرف کیسے نکلا جائے- کئی مرتبہ حالات سے مجبور ہو کر واپس پاکستان آنے کے بارے میں بھی سوچا- بلکہ ایک مرتبہ تو واپسی کا پکا ارادہ کر لیا- لیکن آگے اندھیرا نظر آ رہا تھا لہٰذا چپ سادھ لی' ایک روز میرے ساتھ رہنے والے نوجوان نے کہا کہ میں آگے کی طرف جا رہا ہوں- پھر اس

نے جو انکشاف کیا وہ میرے لئے بالکل نئی بات تھی جس نے مجھے چونکا دیا' اس نے بتایا کہ ماسکو والے پاکستانی نوجوانوں کو کمیونسٹ ممالک میں اعلیٰ تعلیم کے لئے بالکل مفت تمام مواقع فراہم کرتے ہیں اور ایک ایسے ہی سنہری موقع سے میں بھی فائدہ اٹھانے جا رہا ہوں---- سچ تو یہ ہے کہ مجھے اس نوجوان کی یہ باتیں سن کر نہ صرف دکھ ہوا بلکہ اس کی بدنصیبی پر دل بھی اداس ہوا- لیکن اس میں قصور اس نوجوان کا نہ تھا بلکہ ہمارے ملک میں حالات اس قسم کے پیدا کر دئے گئے تھے کہ نوجوان ہی کیا پوری قوم ایک ہیجان میں مبتلا تھی اور جس کا داؤ لگتا وہ اس کشمکش کی فضا سے باہر نکلنے کا موقع ضرور حاصل کرتا- لیکن میرا ارادہ اور منزل اس نوجوان سے قطعی مختلف تھا- میرا ویزہ ختم ہونے کے قریب تھا اور کوئی دوسری صورت فی الحال نگاہوں سے قطعی پوشیدہ تھی ---------

یہ ڈر ہر وقت لاحق رہتا کہ پاسپورٹ پر چونکہ پیشہ صحافت درج تھا' کہیں یہ ہی نہ سمجھ لیا جائے کہ میں جاسوسی کی غرض سے یہاں آیا ہوں' وزارتوں میں جاتے خوف محسوس ہوتا تھا- بہر حال خدا کے فضل سے مجھے وزارت خارجہ سے مزید ویزہ مل گیا- اب میں صرف ایک نکتہ پر سوچ رہا تھا کہ کس طرح آگے کی طرف نکلا جائے' فلائٹس کی تعداد بڑی محدود تھی' افغانستان کی قومی ایئرلائن اریانا میں جگہ کا حصول جوئے شیر لانے کے مترادف تھا کیونکہ ملی بھگت سے ایجنٹ یہ تمام سیٹیں مختص کرا لیتے اور پھر پاکستانیوں کو استنبول لے جاتے' اس کام کی وہ بڑی بھاری فیس لیتے تھے- استنبول جانے والے پاکستانی یہ خیال کئے ہوتے تھے کہ وہ جونہی استنبول پہنچیں گے تو ان کو فوراً ہی یورپ میں گھس جانے کا چانس مل جائے گا- کئی روز کی دوڑ دھوپ کے بعد مجھے سیٹ مل گئی- اس کے لئے بھی مجھے قلیل سی رشوت دینا پڑی- یہ جہاز تہران سے ہوتا ہوا استنبول پہنچا-

17
ترکی آمد

استنبول پہنچ کر ایک نئی دنیا کا دیدار نصیب ہوا ہزاروں پاکستانی آگے نکل جانے کو بے تاب نظر آتے تھے - کوئی جرمنی اور کوئی ہالینڈ کی بات کرتا - مجھے بھی ایک امید سی ہوئی کہ چلو کم از کم میں ان کے پیچھے پیچھے ہی چل پڑوں گا تو کوئی شاید مناسب مقام آ جائے - پاکستان سے میں چھ سو ڈالر کے ہمراہ چلا تھا اور اب تک کی سرگذشت کے دوران تقریباً تین سو ڈالر میں صرف کر چکا تھا میں یہ بتانا تو بھول ہی گیا کہ استنبول آنے والے جہاز میں یہ سفر میری زندگی کا پہلا تجربہ تھا اس کے دوران دو پاکستانیوں سے جو میرے ہمسفر تھے مختصر بات چیت بھی ہوئی تھی اور استنبول پہنچ کر میں انہی کے ہمراہ ہوٹل میں کمرہ کی تلاش کرنے لگا - جس میں وقتی طور پر ناکامی کا سامنا بھی کرنا پڑا' وقت گذارنے کے لئے شہر میں گھومنے کا پروگرام بنا' ریلوے سٹیشن کا مقام تھا کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا" کھوکھر "- میں نے مڑ کر دیکھا تو یہ میرے شہر میرپور کا ایک نوجوان تھا جو میرا کلاس فیلو بھی رہ چکا تھا' اس کا نام شوکت محمود تھا اس کی روداد سن کر نہ صرف مجھے دکھ ہوا' بلکہ پریشانی بھی کہ کہیں اس جیسا اپنا بھی حال نہ ہو' اس نے بتایا کہ ڈھائی ماہ سے میں یہاں خوار ہو رہا ہوں' پیسے ختم ہو چکے ہیں اور اب دیہاڑیاں لگا کر پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کا اہتمام کر لیتا ہوں بہر حال مجھے اس کے اس طرح اچانک مل جانے کی کس قدر مسرت ہوئی یہ سچ ہے کہ انسان با اعتماد ہو تو اکیلا بھی بڑی سے بڑی مشکل کو قابو کر لینے کی قدرت رکھتا ہے لیکن اس حقیقت سے بھی انکار ممکن نہیں کہ مشکل میں مبتلا با اعتماد شخص بھی کسی کی قربت اور ہمدردوں کا خواستگار ضرور ہوتا ہے چاہے وہ اس کا برملا اظہار نہ کرے لیکن اس کے اندر چھپا ہوا خوفزدہ انسان اس کی خواہش ضرور رکھتا ہے یہی

وجہ تھی اس لڑکے کی رفاقت مجھے وقتی طور پر ہی سہی لیکن اپنے آپ کو سنبھالا دینے کے لئے کافی تھی میں اس کے ہمراہ ہوٹل میں آ گیا جہاں آ کر اس نے مختصر گپ شپ کے بعد ہی مجھے یہ مشورہ دیا کہ تم آگے کو نکل جاؤ۔

18
مشرقی یورپ روانگی

اس ہوٹل میں مقیم کچھ پاکستانی رخت سفر باندھ رہے تھے میں سوچ میں پڑ گیا کہ ان کے ہمراہ ہی کیوں نہ نکل جاؤں اور پھر میں نے اپنے دوست سے مشورہ کے بعد آگے جانے کا فیصلہ کر لیا۔ اسی رات ٹرین کا ٹکٹ لیا اور یوگوسلاویہ جانے والے ڈبے میں براجمان ہو گیا اس دوران اپنے ہمراہ آنے والے دوسرے پاکستانیوں سے حالات حاضرہ پر گپ شپ ہوتی رہی۔ ۲۴، ۲۵ گھنٹے کے سفر کے بعد ہم بلغاریہ کے شہر صوفیہ سے ہوتے ہوئے ایک دوسرے شہر BudaPast میں آوارد ہوئے۔

چونکہ ہمارے کئی دوست ایسے سفر کے دوران کئی قسم کے فراڈ کرتے رہتے ہیں۔ لہٰذا کسٹم حکام بڑی سختی سے چیکنگ وغیرہ کا فرض پورا کرتے ہیں۔ ہمیں بھی کسٹم اور امیگریشن میں سختی سے چیک کیا گیا۔ دراصل استنبول تو ہیرا پھیری کا بہت بڑا گڑھ بن چکا ہے۔ مجھے بھی کچھ لوگوں نے یہ مشورہ دیا تھا کہ یہاں سے ایجنٹ جعلی انڈورسمنٹ کر کے لوگوں کو یورپ پہنچا دیتے ہیں۔ لیکن میں کم از کم اپنے پاسپورٹ پر ایسا کوئی غلط کام کرانے کے حق میں قطعی نہیں تھا۔ میں جب یوگوسلاویہ کے شہر BudaPast بدھاپاسٹ میں پہنچا تو معلوم ہوا کہ اکثر لوگ انگلش کا ایک لفظ نہیں جانتے۔ میں بڑی مشکل میں گرفتار ہو گیا بہر حال امیگریشن والوں سے چھٹکارے کے بعد اب سوچنے لگا کہ اٹلی وغیرہ نکل جاؤں۔ جیب کی حالت بھی خاصی پتلی تھی، جمع شدہ پونجی بھی اگر جاتی رہے تو پھر کیا ہو گا کیونکہ کمیونسٹ ممالک میں کسی قسم کی امداد کی توقع فضول ہے۔ میں یہاں دو دن تک مقیم رہا اور اسی سلسلے میں یہاں موجود یورپی سفارتخانوں کے چکر لگاتا رہا کہ کسی ملک خصوصاً جرمنی یا فرانس وغیرہ کا ویزہ مل جائے۔ لیکن افسوس کہ ہر جانب سے کورا جواب دیا گیا۔ ان کا کہنا

تھا کہ اگر تم نے آگے ہی جانا ہے تو پاکستان سے ویزہ لے کر کیوں نہیں آئے۔ ہوٹل میں اسی ڈر سے قیام نہ کرتا کہ پیسے ختم ہو جائیں گے۔ لہٰذا سارا دن گھوم کر رات سٹیشن کے بنچوں پر گذار دیتا۔ لیکن یہاں بھی ایک ٹریجڈی میری منتظر تھی۔ مجھے پہلی رات معلوم ہوا کہ رات بارہ بجے کے بعد یہاں بھی کسی کو بیٹھنے یا لیٹنے کی اجازت نہیں کیونکہ اس کے بعد سٹیشن کو پانی سے مکمل طور پر دھویا جاتا ہے۔ آدھی رات میں کہیں دوسری جگہ گذار کر صبح سویرے دوبارہ سٹیشن پر آجاتا۔ یہاں کھانے پینے کی بڑی سخت دقت تھی کیونکہ ان ممالک میں حلال حرام کی تمیز رکھنا خاصا دشوار ہے۔ میں نے آخر کار ایک دکان پر اچار دیکھا' ایک بوتل اور ڈبل روٹی کے ہمراہ ٹماٹر بھی خریدے اور پھر تین دن تک انہی کے ساتھ پیٹ کی آگ کو ٹھنڈا کرتا رہا۔ مستقبل کے خواب سوچنا تو ہمت جواب دے جاتی۔ ایک ہی صورت نظر آتی کہ آگے کی طرف چلوں پھر سوچنا کہ آخر کب تک آگے۔ آخر کونسی میری منزل ہو گی۔ بالکل اکیلا ایک کافر ملک میں قسمت سے پنجہ آزمائی کر رہا تھا۔ پھر دو دن کے بعد میں نے فیصلہ کیا کہ اٹلی چلا جاؤں۔ روم کا صرف نام سن رکھا تھا اس کے علاوہ وہاں کے بارے میں میری معلومات صفر تھیں۔ آخر کار ٹکٹ لیا اور ٹرین میں جا بیٹھا۔ ایسی ٹرین میں جو اٹلی جا رہی تھی۔ سوچ رہا تھا کہ اٹلی کے بارڈر پر تو مخصوص مقدار میں کرنسی دیکھنے کے بعد ہی داخلہ کی اجازت مل پاتی ہے۔ لیکن خوش قسمتی نے ساتھ دیا اور بغیر کرنسی دکھائے انٹری مل گئی۔ یہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ روم تو جرائم کا بین الاقوامی اڈہ ہے۔ بہت بڑی بڑی وارداتیں ہوتی ہیں۔ میں نے یہاں پہنچتے ہی اپنا بیگ سٹیشن پر بنے لاکرز میں رکھوا دیا۔ اور سٹیشن پر ہی گھومنے لگا کہ شاید کوئی ہم وطن مل جائے۔ مجھے اس بات کا اب تک تجربہ ہو چکا تھا کہ دنیا کا شاید کوئی مقام ایسا نہ ہو گا۔ جہاں پاکستانی باشندے نہ بستے ہوں' اور ایسا ہی ہوا کہ روم کے ریلوے سٹیشن پر مجھے دو پاکستانی باشندے مل گئے۔ جنہیں مل کر خوشی سی محسوس ہوئی۔ انہوں نے بتایا کہ وہ بھی چند روز قبل ہی یہاں آئے ہیں اور اسی امید پر تکیہ کئے بیٹھے تھے کہ کس طرح کسی منزل مقصود کا رخ کریں۔ اور ایک ایسے ایجنٹ کو جانتے تھے جو پیسے لے کر یورپی ممالک سمگل کر دیتے ہیں۔ میں نے بھی ان کے سامنے اپنا یہ ارادہ ظاہر کیا۔

تو وہ مجھے روم میں ایک ہوٹل کی تیسری منزل پر لے گئے - جہاں ان ایجنٹوں نے کمرہ کرائے پر لے رکھا تھا - میں نے ان سے بات چیت کی تو انہوں نے سیدھا سا جواب دیا کہ ہم جرمنی یا فرانس پہنچا دیں گے - لیکن پانچ سو ڈالر لیں گے - میں سوچ میں میں پڑ گیا کہ اگر انہیں یہ پتہ چل گیا کہ میرے پاس تو پیسے ہی کوئی نہیں تو کہیں کام بگڑ ہی نہ جائے - جبکہ وہ پاسپورٹ بھی مانگ رہے تھے - میں نے اس توقع پر بہانہ لگایا کہ انگلینڈ میں موجود میرے عزیزوں نے مجھے ٹیلکس کے ذریعے یہاں امریکن ایکسپریس میں پیسے بھیجے ہیں اور چند روز تک مجھے مل جائیں گے اور میں ان کو دے دوں گا وہ میرے جواب سے مطمئن ہو گئے اور جواباً کہا کہ ہم تمہیں ضرور فرانس یا جرمنی پہنچا دیں گے مجھے جولڑکے ایجنٹوں کے پاس لے کر گئے وہ اور میں بات چیت کے بعد واپس آ گئے اور یہ سوچنے لگے کہ اب رات کہاں قیام کریں' انہوں نے مجھے اس دوران بتا دیا تھا کہ وہ بھی بے ٹھکانہ ہیں اور رات کو سٹیشن کے ایک کونے میں گتوں کا اوڑھنا بچھونا کر کے گذارا کر رہے ہیں - مرتا کیا نہ کرتا' میں بھی تیار ہو گیا کہ ایسے ہی رات گذار لوں گا - ان تمام مراحل میں بعض اوقات بڑی شدت سے گھر کی یاد ستایا کرتی تھی -

19
مشرقی یورپ کی سیر

جب میں اپنے حاضی حال اور مستقبل پر نگاہ دوڑاتا تو ہر جانب اندھیرا ہی اندھیرا نظر آتا تھا- خیر اب سر پر پڑی کو برداشت تو کرنا تھا' میں ان لڑکوں کے ہمراہ سٹیشن پر آ گیا تا کہ رات بسر کر سکوں کیونکہ میرے پاس اب تک جو پیسے بچ رہے تھے انہیں میں ضائع نہیں کرنا چاہتا تھا رات کوئی بارہ ایک بجے کا ٹائم ہو گا کہ اچانک اٹالین بدمعاشوں نے ہم پر حملہ کر دیا تمام لڑکے مجھ سمیت بھاگ کھڑے ہوئے اور گلیوں میں چھپ کر اپنی جان بچائی حقیقت ہے کہ میں تو سخت ڈر گیا کہ یا خدا یہ کیا ماجرا ہے اور یہ کیسی مصیبت ہے- جب محسوس کیا کہ خطرہ ٹل گیا ہے تو دوبارہ اسی جگہ آ کر سو گئے بعد ازاں خیریت ہی رہی جو ایجنٹ ہمیں ملا تھا اس کے بارے میں پتہ چلا کہ وہ کسی نئے آدمی کو اپنے پاس نہیں ٹھہراتا جبکہ جو لڑکے میرے ہمراہ تھے ان کے بارے میں معلوم ہوا کہ وہ تو اس کے سب ایجنٹ ہیں جو پردیسیوں کو گھیر کر لاتے ہیں اور ان کا تو سارا دن کام ہی یہ ہے پیسوں کے سلسلے میں روزانہ مجھ سے استفسار کیا جاتا اور پھر میرے ہمراہ امریکن ایکسپریس آتے' لیکن ان خدا کے بندوں کو کیا معلوم کہ اگر کوئی پیسے بھیجے گا تو آئیں گے' میں حالات کی نزاکت کو بخوبی سمجھتا تھا اور مجبوراً ٹال مٹول سے کام لیتا رہا' بہر حال ان کو باتوں ہی باتوں میں یہ باور کروا دیا کہ میں صحافی ہوں' جس کے فوراً بعد ہی ان کا رویہ میرے ساتھ واضح طور پر ہمدردانہ ہو گیا' جو میں محسوس ہی نہیں کر رہا تھا بلکہ یہ حقیقت تھی' کیونکہ اب مجھے وہ کہنے لگے کہ کوئی بات نہیں تمہارے پیسے آ جائیں گے' البتہ ہم آپ کا مسئلہ حل کئے دیتے ہیں استفسار پر کہنے لگے ہم یورپ کے خواہشمند افراد کو مشرقی یورپ براستہ' ہنگری' چیکوسلواکیہ وغیرہ لے جاتے ہیں جس کے لئے پاسپورٹ پر ان ممالک کا اندراج ضروری ہے-

جو ہم اپنی مدد آپ کے تحت ہی کر لیتے ہیں لیکن میں بضد رہا کہ جعلی کام میں نہیں کرنا چاہتا- جواباً انہوں نے مجھے مطلع کیا کہ یہاں سے پاکستانی سفارتخانہ کبھی بھی اندراج نہیں کرتا لہٰذا جعلی کے سوا کوئی چارہ نہیں میں نے مذکورہ صورتحال میں خوب سوچ لینے کے بعد از خود ہی پاکستان ایمبیسی جانے کا فیصلہ کیا' میں ان کے ہمراہ پاکستان ایمبیسی آیا' درخواست دی لیکن انہوں نے انکار کر دیا' کہ کسی شخص کو یہ اجازت نہیں دی جا سکتی کہ وہ ان ممالک میں جا سکے' میں نے ایمبیسی کے عملہ کو بتایا کہ میں صحافی ہوں اور یہاں سیاحت کی غرض سے آیا ہوں- اور کمیونسٹ ممالک سے ہوتا ہوا پاکستان جا رہا ہوں لہٰذا مجھے تو انتہائی ضروری یہ اندراج درکار ہے- اس کے ثبوت کے لئے نہ صرف اڈنٹٹی کارڈ وغیرہ دئے بلکہ ماضی میں محکمہ اطلاعات و نشریات کے ایک دوست افسر کے دیئے گئے اس لیٹر نے کام کر دکھایا جو اس نے مجھے کسی مشکل سے نپٹنے کی غرض سے دیا تھا سو یہ تیر چل گیا اور پھر دوسرے لمحے میرے پاسپورٹ پر کمیونسٹ ممالک کے ناموں کا اندراج کر دیا گیا تھا میں ایمبیسی سے باہر نکلا تو دیکھا کہ ایجنٹ بے تابی سے میرا انتظار کر رہے تھے وہ دراصل بحیثیت صحافی مجھے ٹیسٹ بھی کرنا چاہتے تھے کہ اس مرحلے پر ہی انہیں پتہ چل جائے گا میں کتنے پانی میں ہوں میں نے انہیں بتایا کہ میں تو اندراج کرانے میں کامیاب رہا ہوں تو میں نے صاف محسوس کیا کہ ان کے چہرے حیرت سے بھرے پڑے تھے' بلکہ ایک آدمی نے دوسرے کو معانی خیز انداز سے نہ صرف دیکھا بلکہ کہنی سے ٹھوکا بھی دیا-

یہ لمحات اس سارے سفر کے دوران میرے لئے خاصی مسرت کا باعث تھے اور میں ان سے پوری طرح لطف اندوز یا محظوظ ہو رہا تھا وہ غالباً جمعہ کا دن تھا' واپس آئے اور پروگرام بنا کر آئندہ سفر سوموار کے سے شروع کیا جائے' ایک ایجنٹ نے بڑی اپنائیت کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ اس دوران تمہارے پیسے بھی آ جائیں گے- بہر حال بہتر ہو گا کہ آج ہی ان ممالک کے ویزے لے لئے جائیں تا کہ وقت کی بچت بھی ہو اور ذہن سے ایک بوجھ بھی اتر سکے' لہٰذا اب دیگر سفارتخانوں کا رخ کیا جہاں سے خلاف توقع فی الفور' ہنگری' چیکو سلواکیہ' اور مشرقی جرمنی کے ویزے ہمیں حاصل ہو گئے' اب میرے ذہن میں ایک نئی سوچ نے جنم لیا کہ یہ سارے

معاملات تو میں نے خود طے کئے ہیں' تو ان ایجنٹوں کو پانچ سو ڈالر میں کس خوشی میں دوں' اور پھر سچی بات تو یہ بھی تھی کہ میرے پاس تو پیسے تھے ہی نہیں دراصل وہ ایجنٹ جہاں مجھ سے پیسے ہتھیانا چاہتے تھے وہاں دوسرے لوگوں کے پاسپورٹوں پر کمیونسٹ ممالک کے اندر راج کے لئے مجھے استعمال کرنا چاہتے تھے' کیونکہ انہوں نے اس کا مظاہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا بہرحال یہ لمحات میرے لئے عجیب و غریب کشمکش کا دورانیہ تھے۔ میں ڈر بھی رہا تھا کہ پیسوں کی عدم موجودگی کا پول اگر کھل گیا تو کیا ہو گا؟

تین ممالک کے ویزوں کے بعد ہم دوبارہ ان کے ہوٹل پہنچے تو میں اس دوران فیصلہ کر چکا تھا کہ ان لوگوں سے کس طرح جان چھڑائی جائے۔ ہوٹل آمد کے بعد میں نے کہا کہ میں ذرا نیچے جا کر ٹیلیفون کر لوں اور پیسوں کا پتہ کروں تاکہ جلد از جلد اگلا قدم اٹھایا جائے۔ انہوں نے فوراً کہہ دیا کہ اوہو! ٹھیک ہے آپ جا کر پتہ کر آئیں کیونکہ انہیں مجھ پر بے حد اعتماد ہو چکا تھا۔ میں نیچے آ کر ٹیکسی میں بیٹھا اور سیدھا ریلوے سٹیشن پہنچ گیا۔ دل میں سوچ بھی رہا تھا کہ کیا میرا یہ فرار کا فیصلہ غلط تو نہ ہو گا۔ لیکن اب تو واپسی ناممکن سی بات تھی۔ ٹرین کا پتہ کیا کہ یوگوسلاویہ بلغراد کب تک ٹرین روانہ ہو گی۔ پتہ چلا کہ ایک گھنٹے بعد' میں نے غالباً ستر ڈالر کا ٹکٹ خریدنے کے بعد اپنی پونجی پر نگاہ دوڑائی تو ۴۰ ڈالر بچے تھے' یہ جو ٹکٹ میں نے خرید کیا تھا اس میں ہنگری' چیکوسلواکیہ' اور مشرقی جرمنی بھی شامل تھے۔ اب سب سے بڑا مسئلہ جو سر دست درپیش تھا وہ سرحدوں پر کرنسی شو کرنے کا تھا کیونکہ تمام سرحدوں پر تقریباً پانچ سو ڈالر دکھائے جائیں تو آگے جانے کا پروانہ مل پاتا ہے۔ میرے پاس جو ڈالر بچے تھے۔ میں نے انہیں چھوٹے نوٹوں میں تبدیل کروا لیا۔ تمام ڈالر ایک ایک اور سب سے اوپر پانچ ڈالر کا نوٹ رکھا تاکہ ذرا مقدار میں زیادہ نظر آئیں۔

ٹرین پر بیٹھا اور براستہ میلان بلغراد جا پہنچا۔ اس سارے سفر کے دوران میں نے یوں تو رنگ برنگی دنیا دیکھی لیکن میرا ذہن صرف اس سوچ میں مشغول تھا کہ آخر میری منزل کیا ہو گی؟ بلغراد سے پھر میں نے ٹرین تبدیل کی میں کسی بھی ڈبے

میں بیٹھنے سے قبل یہ ضرور دیکھ لیتا کہ یورپین مسافر کہاں بیٹھے ہیں تاکہ ان کے درمیان میں بیٹھا جائے کیونکہ ایشیائی مسافروں کو بڑی سختی سے چیک کیا جاتا تھا۔ چلتے چلتے پھر میں ہنگری جا پہنچا بارڈر پر پاسپورٹ چیک کراتے ہوئے انہیں بتایا کہ صحافی ہوں اور گھومتا ہوا مشرقی جرمنی واپس جا رہا ہوں' کرنسی دکھانے کا مطالبہ ہوا۔ لیکن یہ بھی ایک رسم پوری کی گئی اور نوٹوں کی "گڈی" دور سے ہی دیکھ کر امیگریشن آفیسر مطمئن ہو گیا۔ میرے لئے آگے کا راستہ صاف تھا حالانکہ یہ اقدام سخت بے وقوفی پر مبنی تھا کہ ۴۰ ڈالر کے ہمراہ تین یا چار ممالک کراس کرنے کا ارادہ کر لیا جائے۔ لیکن جیسے کہ میں نے پہلے ذکر کیا کہ میرا وہ "سفری دوست" جو کابل میں مجھے ملا تھا اور تعلیم کے سلسلے میں چیکوسلواکیہ پراگ آیا تھا اور اس نے مجھے اپنا ایڈریس بھی دیا تھا اس کے پاس جانے کی آس تھی' کیونکہ اس نے مجھے کہا تھا کہ اگر کبھی اس طرف نکل آؤں تو اس کے پاس ضرور آؤں۔

کیونکہ ممکن ہے کہ وہ اس کی کوئی مدد کر سکے' میرا چونکہ روٹ بھی یہی تھا میں نے سوچا کہ اگر میں پراگ پہنچ گیا تو اس سے شاید ایک یا دو سو ڈالر یا کوئی اور مدد حاصل کر سکوں۔ کیونکہ پردیس میں اس قدر آس یا امید بھی بہت بڑی بات ہے۔ اس مرحلہ سے جو گذرے ہیں وہ اس بات کو بخوبی سمجھتے ہوں گے۔ اور اسی آس کو ساتھ لئے میں پراگ جا پہنچا' نت نئے خیالات کے ساتھ' ماضی کے دریچوں میں جھانکتے ہوئے' روشن مگر دھندلے مستقبل کی تلاش کے مرحلے میں پراگ پہنچ کر اس دوست کو ڈھونڈنا شروع کر دیا' ان ممالک میں ایک بڑا مسئلہ جو اجنبی کو درپیش آتا ہے وہ زبان کا مسئلہ ہے۔ کیونکہ ہم تو انگلش کو ہی بین الاقوامی رابطہ زبان خیال کرتے ہیں۔ جبکہ دوسرے ممالک میں انگلش کو کوئی اہمیت نہیں دی جاتی اور اس وقت میں خود بھی اس صورتحال سے دوچار تھا' میں بغیر ٹکٹ ہی ٹراموں اور بسوں میں سفر کرنے لگا۔ لیکن سارا دن گذارنے کے بعد بھی اس کا ایڈریس نہ مل سکا۔ شام ۵ بجے ایک ایسا شخص ملا جسے میری طرح ہی ٹوٹی ہوئی انگلش سے شدید تھی۔

اس نے مجھے اس یونیورسٹی کا پتہ سمجھایا اور میں ڈھونڈتے ہوئے وہاں پہنچ جانے میں

کامیاب ہو ہی گیا- وہاں پر موجود سٹاف نے بڑی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور ہاسٹل انچارج سے میری ملاقات کرائی- جس نے اظہار افسوس کرتے ہوئے کہا کہ جس شخص کا آپ پوچھ رہے ہیں وہ تو چند روز قبل یہاں سے جا چکا ہے- اور جس یونیورسٹی میں اس کو بھیجا گیا ہے- وہ یہاں سے تین سو کلو میٹر پیچھے کی طرف ہے- میرے تو پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی- اگر پیچھے کی طرف لوٹ جاؤں تو چالیس پچاس ڈالر خرچ ہو سکتے تھے- اور پر نہ معلوم اس سے کوئی مدد بھی مل سکے یا نہیں- انسان جب ایک در سے مایوس ہو جائے تو فطری سی بات ہے کہ اس کو ہر جانب مایوسی کے سائے اپنی جانب لپکتے نظر آتے ہیں- لیکن میں نے جیسا کہ پہلے بھی بیان کیا ہے کہ میں ایک ایسے راستے پر چل نکلا تھا جس سے واپسی کا کوئی راستہ بھی نظر نہ آتا تھا- اور اسی چیز کو پیش نظر رکھ کر میں آگے کی جانب سوچنے لگا' اب ایک نئی مصیبت یہ بھی آڑے آ چکی تھی کہ اس سارے عرصے میں میرا ویزہ بھی جو صرف چوبیس گھنٹوں پر محیط تھا ختم ہو چکا تھا- اور شاید آپ جانتے ہوں گے کہ کمیونسٹ ممالک میں بغیر ویزہ کے غیر قانونی قیام کی سخت ترین سزا دی جاتی ہے- میں سٹیشن پر واپس آیا اور سوچوں کے تانے بانے بننے میں مصروف ہو گیا کہ ایک آدمی جو ایک کونے میں بیٹھا ہوا تھا اس پر نظر پڑی میرے خیال کے مطابق وہ یقیناً کوئی ایشیائی باشندہ ہے کیونکہ اس کے کالے بال اس بات کی نشاندھی کے لئے کافی تھے-

میں نے اس سے بات کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسرے لمحے میں اسی کے قریب پہنچ چکا تھا اس کو انگلش میں متوجہ کیا اور پوچھا کہ وہ کہاں کا رہنے والا ہے- وہ یقیناً جواب دینے سے پہلے یہ سمجھ چکا تھا کہ میں کہاں کا رہنے والا ہوں اس نے مجھے اردو میں جواب دیتے ہوئے کہا کہ جہاں کے آپ رہنے والے ہیں- میں گرمجوشی سے اس سے ملا کیونکہ میں غیر اتفاقی طور پر اپنے ہم وطن کو پانے میں کامیاب ہو چکا تھا- مجھے قدرتی طور پر ذرا حوصلہ سا محسوس ہوا- اس کے پاس بیٹھا اور اس کو مختصر طور پر اپنے گذشتہ حالات بتائے اور مستقبل کے ارادوں سے آگاہ کیا- اس نے بتایا کہ وہ جرمنی سے نکالا گیا ہے اور اب استنبول جا رہا ہے- جہاں سے ایک مرتبہ پھر جرمنی واپسی کی کوشش کرے

گا- میں نے جب یہ دیکھا کہ یہ شخص تو جرمنی سے ہو کر آ رہا ہے تو اس سے گائیڈنس لینے کا سوچا اور کھلے لفظوں میں نے اس سے کہا کہ وہ میری کیا مدد کر سکتا ہے- اس نے مجھے بتایا کہ ان دنوں تو ایجنٹ ٹرینیں بھر بھر کر مغربی جرمنی لوگوں کو پہنچا رہے ہیں- کیونکہ وہاں پر سیاسی پناہ کے کیس دھڑا دھڑ ہو رہے ہیں-
خصوصاً پنجاب کے علاقے پھالیہ اور گجرات سے روزانہ سینکڑوں لوگ آ رہے ہیں-
یہ بات میرے لئے خاصی حوصلہ افزا تھی- پھر اس فرشتہ صفت انسان نے جس کا افسوس کہ مجھے نام فراموش ہو چکا ہے ایک مفصل نقشہ بنا کر دیا کہ میں نے یہاں سے آگے مشرقی اور پھر مغربی برلن کس کس طریقہ سے پہنچنا ہے- اور وہاں کیس درج کرانے کے لئے کونسا وکیل کار آمد ثابت ہو سکتا ہے- اس وکیل کا نقشہ بھی اس نے مجھے بنا دیا- اس کے بعد اب میرے لئے سب سے کٹھن مرحلہ یہ تھا کہ میں یہاں سے کیسے نکلوں- کیونکہ میرا ویزہ ختم ہو چکا تھا اور مشرقی برلن میں داخلہ سے قبل یقیناً مجھے چیک کیا جانا تھا- جبکہ میرے پاس تو گنتی کے چند ڈالر باقی بچ پائے تھے، لیکن ان مراحل سے گذرے بغیر کوئی چارہ بھی تو نہ تھا-

خدا کا نام لیکر میں رات گیارہ بجے کی ٹرین میں سوار ہو گیا- جو مشرقی برلن جا رہی تھی، بارڈر پر مجھے روک لیا- کاغذات وغیرہ چیک کرنے لگے تو میں نے اشاروں سے بتایا کہ میں صرف ایک زبان اردو جانتا ہوں- اس کے علاوہ مجھے اور کوئی زبان نہیں آتی- وہ میرے ساتھ انگلش میں باتیں کر رہے تھے- جسے میں جان بوجھ کر سمجھتے ہوئے بھی انجان بنا ہوا تھا- انہیں سخت غصہ آیا- اور وہ بار بار کہہ رہے تھے- کہ تمہارا ویزہ ختم ہو چکا ہے- لیکن تم کہاں رہے ہو، کسی ہوٹل کابل وغیرہ دکھاؤ جہاں تم نے قیام کیا ہو- میں اندر ہی اندر میں سخت خوفزدہ تھا کہ خدانخواستہ انہوں نے مجھے واپس بھیج دیا تو کیا ہو گا- خداوند تعالیٰ جس صورتحال میں جس شدت سے آتا ہے یہ وہی لمحات تھے- بہرحال ہمیشہ کی طرح اللہ تعالیٰ نے میری مدد کی اور میں آگے جانے کا اجازت نامہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا- لیکن امیگریشن کے اہلکاروں نے مجھ سے بطور جرمانہ ۱۰ ڈالر ہتھیا لئے- میں نے خدا کا شکر پڑھا اور آدھ گھنٹے کے کڑے

امتحان کے بعد میں ایسٹ برلن جانے والی ٹرین میں سوار ہو گیا- جو صبح سویرے بڑے ریلوے سٹیشن پر جا رکی- میں نے پروگرام کے مطابق اپنا بیگ ریلوے سٹیشن پر ہی جمع کرا دیا اور نقشے کے تحت ایک لوکل ٹرین میں سوار ہو گیا اور تین سٹیشن آنے کے بعد اترا گیا- اور اسی نقشے کے مطابق جس جانب سے بھی

جس طرف جاؤں تو آگے پولیس کھڑی نظر آئے میں سوچنے لگا کہ اس شخص نے مجھ سے جھوٹ نہ بول کر میں باآسانی پکڑا جاؤں- اس کشمکش میں تقریباً ۳ گھنٹے گزر گئے- دراصل اس بات کا علم نہ تھا کہ جسے میں پولیس تصور کر رہا ہوں یہ تو امیگریشن کا سٹاف ہے- ڈر کے مارے کسی سے پوچھتے ہوئے بھی ہچکچا رہا تھا کہ مبادا کہیں واپس نہ بھیج دیں- لیکن مجبوراً ایک دو آدمیوں سے پوچھا کہ مجھے مغربی برلن جانا ہے تو کیا کروں تو پھر انہوں نے مجھے اسی جانب بھیج دیا- بڑا پریشان ہوا' اور پھر بالآخر دل کڑا کر کے میں اس طرف چل پڑا انہیں اپنا پاسپورٹ دیا تو انہوں نے بغیر کسی سوال کے اس پر آؤٹ کی مہر لگا دی' اب میں بھی دوسرے لوگوں کے پیچھے چل پڑا-

20
مغربی برلن میں

میں چل تو پڑا لیکن یہ علم نہ تھا کہ یہ کونسی جگہ ہے حالانکہ میں مغربی برلن میں داخل ہو رہا تھا آگے آیا تو زیر زمین ریلوے سٹیشن تھا میں بھی دوسروں کی تقلید کرتا ہوا ٹرین میں جا بیٹھا ٹکٹ تو لیا ہی نہیں کیونکہ یہ علم ہی نہ تھا کہ ٹکٹ کہاں سے ملے گا آپ نے دیکھا ہو گا کہ یورپ میں زیر زمین ریلوے سٹیشن سے باہر نکلنے والے راستے ایک کیبن میں ایک سٹیشن ماسٹر موجود رہتا ہے میں نے جب اس سٹیشن ماسٹر کو دیکھا تو گھبرا گیا- اس کی چمکتی ہوئی وردی اس بات کی غمازی کر رہی تھی کہ جیسے وہ پولیس مین ہے لہٰذا اسے دیکھتے ہی میں دوڑ کر ٹرین میں جا بیٹھا پھر میں نے سوچا کہ متعدد لوگ اس کی بائیں جانب سے باہر نکل رہے ہیں تو میں نے بھی دوسرے لوگوں کے پیچھے چلنے کا فیصلہ کر لیا اور تقریباً دوڑتا ہوا باہر کی جانب لپکا' پیچھے بھی مڑ مڑ کر دیکھ رہا تھا کہ کوئی مجھے پکڑنے کے لئے تو نہیں آ رہا' عجیب و غریب صورتحال تھی اپنے طور پر اب تک میں مشرقی جرمنی میں ہی گھوم رہا تھا' لیکن جونہی میں زیر زمین سٹیشن سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ یہاں تو کوئی اور ہی دنیا آباد ہے' پہلی بار یورپ کی کسی ترقی یافتہ معاشرہ کو جو دیکھ رہا تھا' ہر جانب خوشحالی دکھائی دی' چمکدار سڑکیں اور بلند و بالا عمارات میری آنکھیں کھول دینے کے لئے کافی تھیں' لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں نے کسی سے پوچھنے سے گریز کیا نہ جانے کہاں کہاں گھومتا رہا اور بارہ بج گئے اور بھوک ستانے لگی میرے پاس غالباً 7 یا 8 ڈالر تھے ایک بینک سے ڈالر تبدیل کرائے اور ایک سٹور سے بسکٹ کا ڈبہ اور سیون اپ کا ڈبہ خرید لیا' کھا بھی رہا تھا اور سوچ بھی رہا تھا کہ رات کہاں بسر کروں گا'- اکتوبر کا پہلا ہفتہ تھا سردی بھی خاصی پڑ رہی تھی بیگ بھی مشرقی برلن چھوڑ آیا تھا گرم کپڑے

وزیر اعلیٰ سندھ قائم علی شاہ کے حالیہ دورہ لندن کے موقع پر لی گئی ایک تصویر

کوئی نہ تھے' البتہ اس سے قبل میں نے سردی کی وجہ سے دو قمیض اور دو پتلونیں اوپر تلے زیب تن کر رکھی تھیں جس کچھ کچھ صورتحال قابو میں تھی' اب میں نے سوچا کہ ہمت کر کے کسی سے پوچھ ہی لیا جائے کیونکہ سارا دن آوارہ گردی کرتے کرتے میں سخت تنگ آچکا تھا پھر یوں بھی آگے اب رات آرہی تھی' کیونکہ 4 بج چکے تھے - ایک شخص نظر آیا جس کے بال کالے تھے میں اس کے قریب گیا اور ڈرتے ڈرتے استفسار کیا بھائی صاحب! آپ غالباً انڈین یا پاکستانی دکھائی دیتے ہیں اس نے برجستہ جواب دیا' پاکستانی میں نے اس سے کہا چونکہ میں نیا آیا ہوں پاکستانی ہوں حتی کہ یہ بھی نہیں جانتا کہ اس وقت کہاں کھڑا ہوں جب اس نے یہ سنا کہ میں نیا ہوں تو وہ ذرا گھبرایا اور جان چھڑانے کے سے انداز میں بولا' بھائی صاحب آپ اس وقت مغربی برلن میں ہیں اور میں ذرا جلدی میں ہوں' ایک کام سے جارہا ہوں اور ساتھ ہی میرے پوچھے بغیر بولنے لگا کہ یہاں نئے آنیوالوں کو پولیس گرفتار کرلیتی ہے' افسوس کہ میں آپ کی کوئی مدد نہیں کرسکتا' اور ساتھ اس نے اپنی راہ لی-

یہ انکشاف میرے لئے مزید پریشانی کا باعث بن گیا کہ پولیس نئے آنیوالوں کو گرفتار کرلیتی ہے میں خوفزدہ ہو گیا اور محتاط انداز سے چاروں جانب نگاہ رکھ کر چلنے لگا' کہ اتنے میں ایک اور پاکستانی باشندہ نظر آیا ڈوبتے کو تنکے کا سہارا والی بات تھی' میں فوراً لپکا اور اس کو جالیا' اس نے مجھے سر تا پا دیکھا اور بولا' جی کیا بات ہے؟ میں نے کہا جناب شاید آپ پاکستانی ہیں؟ جواب ملا' بالکل میں نے پھر اس کو مختصراً اپنی روداد سنائی تو جیسے کہ اس کا دل بھر آیا ہو فوراً بولا آپ میرے پیچھے پیچھے آئیں میں چلنے لگا تھوڑی دور ہی اس کا ایک اپارٹمنٹ میں کمرہ تھا جہاں وہ رہائش پزیر تھا وہاں پہنچ کر اس نے کہا کہ سب سے پہلے آپ چائے پئیں اس دوران اس نے مجھے کافی حوصلہ دیا اور کہا کہ اب جب کہ آپ آگئے ہیں تو ہمت کریں سب ٹھیک ہو جائے گا وہ خود بھی سیاسی پناہ کے تحت رہ رہا تھا- میں نے اسے وکیل کا ایڈریس بتایا تو اس نے کہا کہ نیچے ٹیکسی سٹینڈ سے آپ ٹیکسی میں بیٹھیں وہ آپ کو اس کے "دفتر" لے جائے گا-

میری تو جان میں جان آئی نیچے گیا ٹیکسی میں بیٹھا اور تھوڑی دیر کے بعد ہی میں اس وکیل کے دفتر کے سامنے تھا رسیپشن پر جا کر اپنا مقصد بیان کیا' وہاں پر مجھے کہا گیا کہ

آپ اپنا نام درج کرا کے انتظار گاہ میں بیٹھیں باری آنے پر آپ کو بلا لیا جائے گا میں ہدایت کے مطابق نام درج کرا کے بیٹھ گیا اس وقت تک تقریباً اندھیرا چھا چکا تھا وہاں انتظار گاہ میں میں نے دیکھا کہ کچھ اور پاکستانی بھی موجود تھے جو شاید مجھ سے بہت پرانے تھے اور اپنے اپنے کیس کے سلسلے میں وہ آپس میں اس وکیل کے بارے میں باتیں کرتے ہوئے کہہ رہے تھے کہ یہ وکیل نہیں بلکہ دوکاندار ہے کیونکہ پیسے لینے کے باوجود صحیح کیس تیار نہیں کرتا جب کہ اس کا جو ترجمان ہے وہ بھی بہت بڑا فراڈ ہے۔ لوگوں سے پیسے لے کر وکیل کو نہیں دیتا جس کے باعث کئی لوگوں کو اس نے جرمنی سے نکلوانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ میں یہاں یہ بھی بتاتا چلوں کہ بعد ازاں اس پر کیس چلا اور اس کو پکڑ لیا گیا تھا' بہر حال یہ ساری باتیں سن کر پریشان ہوا فطری سی بات تھی کیونکہ یہ لوگ کہہ رہے تھے کہ یہ وکیل پیسوں کے بغیر بات نہیں کرتا جب کہ میرے پاس تو صرف چار یا پانچ مارک باقی بچے تھے'۔

اس شش و پنج میں مبتلا تھا کہ دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے وہاں موجود ایک خاموش طبع آدمی کے پاس گیا اور اسے اپنی آپ بیتی سناتے ہوئے کہا کہ میں یہاں بالکل ہی نیا ہوں اور واقعی پاکستان میں مشکلات سے دوچار ہو کر یہاں بھاگ کر آیا ہوں جب کہ میرے پاس تو پیسے بھی کوئی نہیں۔ یہ بات سن کر اس نے کہا کہ آپ کا کیس کتنا سچا اور مضبوط کیوں نہ ہو' یہ شخص بغیر پیسوں کے تو بات نہیں کرتا لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ یہاں سے کچھ ہی دور ایک اور وکیل رولف ڈیٹر ہے وہ ایک تو اچھا آدمی ہے دوسرے وہ انسانی ہمدردی بھی رکھتا ہے۔ اگر آپ وہاں جا کر اس سے بات کرنا چاہیں تو میں تمہیں وہاں لے جاتا ہوں۔ میں نے فوراً حامی بھر لی اور دوسرے لمحے ہم دونوں اس وکیل کی جانب چل پڑے' اس نے باہر آ کر زیر زمین سٹیشن سے ٹرین کا ٹکٹ لیا اور مجھے تاکید کی کہ اگر تمہیں کوئی پولیس وغیرہ کا آدمی چیک کرے تو میرا ذکر بالکل نہیں کرنا میں نے وعدہ کیا کہ ایسا ہی ہو گا'۔

تین چار اسٹیشنوں کے بعد ہم ٹرین سے نیچے اترے۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد اس نے مجھے کہا کہ وہ سامنے اس وکیل کا دفتر ہے لیکن اس کو یہ بالکل نہ بتانا کہ مجھے کوئی پاکستانی یہاں لے کر آیا ہے بلکہ تم نے کہنا ہے کہ میرا ایک دوست حال ہی میں

پاکستان گیا ہے جسے پولیس نے نکال دیا تھا تو اس نے مجھے تمہارا ایڈریس بتایا تھا- بہر حال میں اندر چلا گیا مجھے یہ ہوش نہ تھا کہ میں رات کہاں گزاروں گا' اندر گیا تو دیکھا کہ دو تین آدمی اور بیٹھے ہوئے تھے جب کہ وکیل کا ترجمان لاہور کا ایک نوجوان خالد محمود تھا- میں اپنی باری پر وکیل کے چیمبر میں چلا گیا انہوں نے مجھ سے بے شمار سوالات کئے یعنی جو سوال پولیس نے کرنے تھے وہ سب انہوں نے پوچھ لئے- اور جب میرے جواب انہوں نے پوری تفصیل سے سن لئے تو کہا کہ یہ ایک شاندار کہانی گھڑی گئی ہے- جس پر میں نے کہا کہ ایسی کوئی بات نہیں میں بالکل سچ بول رہا ہوں- میں اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتا تھا کیونکہ عملی طور پر تو میرے پاس کوئی ثبوت نہ تھا لیکن شاید انہوں نے میری بات کا یقین کر لیا اور وکیل نے کہا کہ اگر تمہاری داستان واقعی درست ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تمہارا کیس کافی مضبوط بنے گا اور میرا کیس تیار کیا اور کہا کہ میری فیس دو سو مارک ہے جو آپ کو ابھی ادا کرنا ہو گی' میں نے وہ چار یا پانچ مارک جو مری جیب میں تھے نکال کر اسکی میز پر رکھ دیئے وہ ہنسا اور استفسار کیا کہ یہ کیا؟ میں نے اسے پھر بتایا کہ میں خود یہ سوچ رہا ہوں کہ میں کس طرح مغربی برلن تک پہنچنے میں کامیاب ہوا ہوں' کیونکہ میرے پاس یہی پیسے بچے ہیں- اس وکیل نے مجھے جواباً کہا کہ تم یہ بھی رکھ لو' بعد میں دیکھ لیں گے' اور ایک لیٹر مجھے دیدیا کہ تم کو اگر پولیس چیک کرے تو یہ دینا کیونکہ اس روز جمعہ تھا اور میں پولیس کے پاس کیس رجسٹر کرانے کے لئے سوموار کو ہی جا سکتا تھا- میں تو خوشی سے پھول گیا مجھے اپنی منزل کا عکس دکھائی دینے لگا' یہاں تک پہنچنے میں میں کس کس مرحلے سے گزرا تھا'- اس کا اندازہ اب آپ بھی بخوبی لگا سکتے ہیں-

میں لیٹر لے کر باہر نکلنے لگا تو اس وکیل کے ترجمان نے آہستہ سے کہا کہ تم باہر میرا انتظار کرو- میں نے کہا اچھا!! اور باہر نکل آیا اور کھڑا ہو گیا کافی دیر تک کھڑا رہا کہ وہ کب آئے جب بہت دیر ہو گئی تو میں چل پڑا' میں جونہی چلا تو پیچھے سے آواز آئی کہ کھوکھر !! میں نے مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکا تھا'- میں رک گیا' وہ قریب آیا اور کہا کہ تمہارے حالات تو مجھے معلوم ہو ہی چکے ہیں- لیکن یہ بتاؤ کہ رات کہاں گزارو

گے میں نے کہا کہ اس کا فی الحال تو مجھے بھی علم نہیں - اس نے کہا تو پھر میرے ساتھ آؤ وہ مجھے لے کر ٹرین میں بیٹھا اور ایک جگہ جہاں فلیٹ نما عمارت تھی وہاں لے گیا یہاں پر بے شمار انڈین اور پاکستانی آباد تھے'- یہاں پر بھی اس کے دوست رہتے تھے وہ مجھے ان کے پاس لے کر گیا اور انہیں کہا کہ یہ میرا دوست ہے اس کا پوری طرح خیال رکھنا اور تین دن تک تمام خرچ تم نے ہی ادا کرنا ہے - اس کے بعد وہ چلا گیا جب کہ اس کے دوستوں نے میری خوب آؤ بھگت کی-

21
پولیس کے چھاپے

یہاں ایک مسئلہ اور در پیش آیا کہ اس علاقہ میں ہر روز سینکڑوں لوگ آرہے تھے جس کی وجہ سے پولیس آئے روز چھاپے مارتی تھی میں جمعہ اور ہفتہ کا دن وہاں رہا دن کو تاش وغیرہ کھیلنے میں وقت گزارتے یہ ہفتہ کے روز کا واقعہ ہے کہ ہم چوتھی منزل پر واقع اپنے کمرے میں بیٹھے تھے کہ ایک لڑکے نے ویسے ہی نیچے جھانکا تو دیکھا کہ پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں اور پولیس ایک ایک کمرہ کو چیک کر رہی تھی تاکہ غیر قانونی طور پر رہنے والوں کو گرفتار کر سکے' بس پھر کیا تھا کھلبلی مچ گئی مجھے دوسرے لڑکوں نے کہا کہ تم فوراً بھاگ جاؤ کیونکہ فی الحال باضابطہ طور پر میرا کیس تو رجسٹر نہیں ہوا تھا اور ڈر تھا کہ کہیں پکڑا گیا تو پولیس وکیل کو اطلاع کئے بغیر واپس پاکستان ہی نہ بھیج دے لہٰذا میں بھاگ کر کمروں کے ساتھ بنے آخری ٹائلٹ میں جا گھسا کافی دیر کے بعد اس منزل پر پولیس کے قدموں کی آہٹ سنائی دی'۔ اب تو مجھے یقین ہو چلا تھا کہ میں پکڑا جاؤں گا کافی دیر تک پولیس کمروں کی تلاشی لیتی رہی لیکن خدا کا شکر کہ اس جانب کا رخ نہیں کیا اور اس طرح ایک بار پھر میں بچ نکلنے میں کامیاب ہو گیا میں تقریباً ایک ڈیڑھ گھنٹہ تک وہاں بیٹھا رہا اور جب باہر نکلا تو پتہ چلا کہ تقریباً 26 ' 27 آدمیوں پکڑ کر لے گئے ہیں خوف و ہراس کی عجیب و غریب فضا تھی'۔

ہر شخص سہما سہما اور ڈرا ڈرا سا دکھائی دیتا تھا'۔ اگرچہ اپنی زندگی کے اس انوکھے سفر کے دوران میں اب تک ایسے حادثات کا کافی حد تک عادی ہو چکا تھا لیکن بہر حال بُری گھڑی میں گھبرا جانا بھی تو فطری سی بات ہے۔ اور اس وقت میں کچھ ایسی ہی کشمکش کا شکار تھا۔ خیر! باہر آیا تو دوسرے لوگوں نے مشورہ دیا کہ تم یہاں سے فی الوقت کسی

"محفوظ" مقام پر چلے جاؤ کیونکہ یہ جرمن پولیس کی حکمت عملی ہے کہ وہ اکثر اوقات ایک کے بعد دوسری مرتبہ ضرور چھاپہ مارتے ہیں۔ان کا خدا بھلا کرے کہ سخت سردی کے پیش نظر مجھے ایک اوور کوٹ فراہم کر دیا اور جاتے ہوئے نصیحت کی کہ رات تو باہر گزار لو البتہ دن کو یہاں آ کر سو جانا'۔مرتا کیا نہ کرتا باہر نکل آیا اور رات بھی چھپ چھپ کر درختوں اور دیواروں کی آڑ میں پھرنا شروع کر دیا'۔ نیند سے برا حال لیکن پکڑے جانے کا خوف' دور سے کوئی گاڑی نظر آئے تو وہیں دبک جاؤں ایسی رات کہ ناقابل فراموش!!

صبح سات بجے کا وقت ہو گا کہ میں دوبارہ اسی کمرے میں آیا جہاں سے رات گیا تھا اور آتے ہی دھڑام سے بستر پر دراز ہوا اور دنیا و مافیہا سے بے خبر کئی گھنٹے پڑا سوتا رہا۔اٹھا جو میسر تھا کھایا' اور اسی روز پھر 9 بجے شب باہر نکلنا پڑا اس کی وجہ یہ بتائی گئی تھی کہ کل میرا کیس رجسٹر ہونا تھا اور اگر خدانخواستہ چھاپہ دوبارہ پڑ گیا تو پھر سارا کام چوپٹ ہونے کا خطرہ تھا' گذشتہ کی طرح اس رات بھی اپنی جان سے وہی حشر اہوا' بہر حال آج میں کل کے مقابلے میں خود کو کافی بہتر محسوس کر رہا تھا۔خدا خدا کر کے یہ اذیت ناک شب بھی بسر کی اور صبح سویرے وکیل کے پاس جا حاضری دی' اس شریف آدمی نے فی الفور کیس تیار کر کے کہا کہ ابھی اور اسی وقت پولیس سٹیشن چلے جاؤ۔بھاگم بھاگ' پوچھتا' دریافت کرتا پولیس سٹیشن جا پہنچا دیکھا تو کافی لمبی لائن مجھ سی پہلے وہاں موجود تھی---ان لوگوں نے شاید رات پولیس سٹیشن کی باہر بسر کی تھی!!

طویل انتظار کے بعد میری باری آئی اور اس طرح میں نے بھی اپنی کیس سیاسی پناہ کے حصول کی غرض سے جمع کرا دیا'۔وہاں نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا سے تعلق رکھنے والے جو اپنے اپنے ممالک میں کسی نہ کسی طرح مصیبت میں مبتلا تھے وہ سیاسی پناہ کے حصول کے لئے یہاں جمع تھے۔ایک ہجوم تھا جو لگاتار مشرقی جرمنی سے مغرب جرمنی میں داخل ہو رہا تھا چونکہ مشرقی جرمنی والے چوبیس گھنٹے کا ویزہ دے دیتے تھے اور ویزے کے اختتام پر واپس بھیجنے کی بجائے مغربی جرمنی کی سرحدوں کی جانب دھکیل دیتے تاکہ ان کے لئے معاشی مسائل پیدا ہوں یہ ان کی ایک طرح سے

سیاسی چال تھی جس کا کوئی توڑ سر دست مغربی جرمنی کے پاس نظر نہ آتا تھا- حالانکہ مشرقی جرمنی کو یہ پیشکش کی گئی تھی کہ جس قدر غیر ملکی سیاحوں کی صورت میں ان کے ہاں آتے ہیں اور ان کی آمد سے جس قدر آمدن ہوتی ہے وہ مغربی جرمنی ادا کرنے کو تیار ہے لیکن مشرقی جرمنی کی جانب سے اس ضمن میں کوئی حوصلہ افزاء جواب موصول نہیں ہو سکا-

بہر حال! میرا نمبر آیا تو مجھے دو ہفتے بعد آنے کو کہا گیا' اس وقت دراصل یہ طریقہ کار تھا کہ سیاسی پناہ کے لئے آنیوالوں کا استقبال ایک عارضی عدالت کرتی تھی جو صرف ایک یا دو ہفتوں میں سائل کی درخواست کا فیصلہ کرنے کی مجاز تھی' اگر عدالت کے نزدیک کسی شخص کو واقعی اس کے ملک میں مشکلات کا سامنا ہے تو اس کا سیاسی پناہ کا کیس زیر غور رکھنے کی سفارش کی جاتی دیگر صورت اس وقت اس شخص کو پولیس کی مدد سے ملک سے باہر نکالا جاتا تھا- مجھے جب تاریخ ملی تو اس کے ساتھ جیب خرچ کے لئے 70 مارک بھی دیدیئے گئے اور ہوٹل میں کمرہ بھی دیدیا گیا' جہاں آنے پر دیکھا کہ بے شمار لوگ ہوٹل میں پہلے سے موجود تھے' بہر حال یہ دو ہفتے تو دعائیں کرتے کرتے گزر گئے کہ تاریخ پر کہیں جیل نہ بھیج دیئے جائیں-

مقررہ تاریخ پہ میں وہاں گیا تو بیانات کا سلسلہ شروع ہوا' فنگر پرنٹ اور فوٹو اتارے گئے اور ایک کمرہ میں لا کر بٹھا دیا گیا اس موقع پر وہاں موجود عملے کی حرکات و سکنات سے شبہ ہوا کہ دال میں کچھ کالا ہے- اور خبر تب ہوئی جب پولیس کی گاڑی ہمارے سامنے آکر رکی اور حکم ملا کہ چلو اس میں بیٹھو- ڈر اور خوف کے مارے برا حال-

22

سلاخوں کے پیچھے

بادل نخواستہ جیل آپہنچے' جہاں آ کر پہلے سے موجود لوگوں کی زبانی عجیب و غریب قصے کہانیاں سن سن کر دل میں اک ہول سا اٹھتا اور جی متلانے لگتا! کوئی کہتا کہ گزشتہ دو ماہ سے یہاں ہے اور کسی کا بیان تھا کہ وہ کئی ہفتوں سے یہاں مقید ہے طرح طرح کی باتیں انسان کے دل و ذہن کو تبدیل کرنے میں کافی موثر ثابت ہوتی ہیں میں بھی چپ کر کے سنتا رہا' میرے ہمراہ رہنے والے دو لڑکوں نے ایک روز استفسار کیا کہ "بھائی تم خاموش خاموش رہتے ہو اس کی کوئی خاص وجہ ہے- میں نے جواباً کہا کہ ایسی کوئی خاص وجہ تو نہیں بس مستقبل کے اجالوں کی تلاش کے تانے بانے بنتا رہتا ہوں- دوران گفتگو یہ انکشاف ہوا کہ یہاں سے اس شخص کو باہر لے جاتے ہیں جو زیادہ بیمار ہو'- جب کہ میں گزشتہ کئی روز سے اپنے اندر نقاہت سی محسوس کر رہا تھا اس کی وجہ ایک تو ہلکا بخار تھا اور دوسرے جسم میں درد' یہ ساری باتیں دو راتیں یخ بستہ ہواؤں کے ہمراہ کھلے آسمان تلے گزارنے کا نتیجہ تھیں-

میں نے سوچا کہ میں کیوں نہ ہسپتال چلا جاؤں- لیکن مجھے بتایا گیا کہ معمولی کیس ہو تو جیل کا ڈاکٹر اسے حل کر لیتا ہے اس کے لئے ذرا زیادہ "بیمار" بننا پڑے گا- اور ظاہر ہے کہ یہ کام ذرا ایکٹنگ طلب ہے- میں نے مشورہ کیا اور پھر دوسرے ہی لمحے میری پیٹ میں شدید "درد" اٹھ کھڑا ہوا' میرے واویلا کرنے پر جیل کا ڈاکٹر دوڑا آیا' استفسار کیا' اور ان لڑکوں کے بتانے پر اس نے تھرمامیٹر میرے منہ میں لگایا اور باہر نکل گیا اس کی باہر نکلتے ہی ایک لڑکا جو خاصا شرارتی تھا اس نے وہ تھرمامیٹر چولہے پر چڑھتے ہوئے کھولتے پانی میں ڈال دیا اور ڈاکٹر کے آنے سے قبل ہی میرے منہ میں لگا دیا'--ڈاکٹر واپس آیا تو دیکھ کر حیران رہ گیا کہ تھرمامیٹر تو 104 سے

بھی زیادہ بخار ظاہر کر رہا تھا"۔اس نے فی الفور ایمبولینس منگوائی "اور مجھے سٹریچر پر ڈال کر تین منزل سیڑھیوں کے ذریعے نیچے لے کر آئے اور پھر دوسرے لمحے ایمبولینس بگل بجاتی ہسپتال کی جانب رواں دواں تھی۔ میں اس "شان و شوکت" پر دل ہی دل میں ہنس رہا تھا اور اس پر لطف مذاق پر اپنے طور ہی محفوظ ہو رہا تھا۔

23
ہسپتال منتقلی

ہسپتال کے ڈاکٹر نے جب جیل کے ڈاکٹر کی رپورٹ پڑھی اور دوبارہ تھرمامیٹر کے ذریعے بخار چیک کیا تو نتیجہ بالکل مختلف یعنی اب تو تھرمامیٹر بالکل نارمل ٹمپریچر دکھا رہا تھا"۔ وہ بڑا متعجب ہوا اور کہا کہ یہ ناممکن سی بات ہے لہٰذا میں مکمل تحقیق کروں گا۔ مجھے چونکہ زبان کا بڑا مسئلہ تھا لہٰذا ایک ترجمان کے ذریعے میرا بیان قلمبند کیا گیا میں نے انہیں پوری روداد سنائی کہ کس طرح مجھے پاکستان میں پولیس تشدد کا نشانہ بنایا گیا" میرا خون پیشاب چیک ہوا اور پوچھا کہ خاندان میں کوئی موروثی بیماری تو لاحق نہیں۔ میں نے اس کا نفی میں جواب دیا۔ جس پر میرا مکمل چیک اپ کرایا گیا تو یہ انکشاف میرے لئے بھی حیران کن تھا کہ پاکستان میں پولیس تشدد کے باعث میرے جسم کے اندرونی چھاتی کے کسی حصے میں خون جم چکا ہے جو سانس کی وجہ سے بیماری کا موجب بنا ہے یہی وجہ تھی کہ سرد علاقے میں آنے کے باعث مجھے سانس کی بیماری کی شکایت ہو چکی تھی۔ ڈاکٹروں نے کہا کہ اس کا علاج ہو گا اور اگر ضرورت محسوس ہوئی تو تمہارا آپریشن بھی کیا جائے گا پھر مجھے ہسپتال میں داخل کر لیا گیا۔

بوربور سی زندگی کا ایک مرتبہ پھر آغاز سوچنے لگا کہ اس سے بہتر تو جیل تھا جہاں گپ شپ سے ہی وقت گزر رہا تھا اس ہسپتال میں تین ماہ تک زیر علاج رہا اس دوران میں نے ترکی کے بعد پہلی مرتبہ گھر خط ارسال کیا اور اپنے تمام حالات سے انہیں مطلع کیا، کیونکہ وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ میں پاکستان میں ہی یا کسی دوسرے ملک کی جیل میں قید چکا ہوں، اس دوران میں نے اپنے ضروری کاغذات جو کچھ تو انگلینڈ میں تھے اور کچھ پاکستان میں اپنے پاس منگوا لئے تاکہ بوقت ضرورت ان سے فائدہ اٹھایا جا

سکے - ہسپتال سے فارغ ہوا تو میری درخواست پر بھی انہی دنوں فیصلہ ہو گیا اور عدالت میں اس کیس کی سماعت کا فیصلہ کر لیا گیا' اس خوشخبری کے بعد مجھے یقین ہو چلا تھا کہ آئندہ دنوں میں مزید اچھی خبریں سننے کو ملیں گی ایک آس سی بن گئی تھی کہ میری اس قدر محنت انشاء اللہ رائیگاں نہیں جائیگی جب میری درخواست سماعت کے لئے منظور ہوئی تو میں اپنے آپ کو کس قدر ہلکا پھلکا محسوس کر رہا تھا کیونکہ اب کم از کم مجھے اپنا نقطہ نظر پوری طرح بیان کرنے کا موقع تو میسر آچکا تھا

ہسپتال سے اب دوبارہ ہوٹل منتقل کر دیا گیا جہاں پر ہمیں جو کچھ میسر تھا وہ کھا لیتے اور ۴۵ مارک ماہانہ یعنی پاکستانی اڑھائی سو روپیہ جیب خرچ کے طور پر ملتے تھے اس طرح چھ ماہ گزارا کرتے رہے کبھی مایوسی ' کبھی امید کے دن کٹ رہے تھے اس دوران ہر روز ہزاروں افراد سیاسی پناہ کے لئے جرمنی میں داخل ہو رہے تھے جس کی وجہ سے برلن سے دیگر صوبوں میں لوگوں کو بھیجا جا رہا تھا اب یہ سوچ گھیرے ہوئے تھی کہ نہ جانے کس مقام پر بھیجیں گے ' کیسا ماحول اور کیسے لوگ ہوں گے لیکن ایک قیدی کی حیثیت سے رہنے والے انسان کے اپنے خیالات اور احساسات دوسروں کے قبضہ میں ہوتے ہیں اور وہ خود ایک کٹھ پتلی کی طرح ڈور ہلنے پر حرکت کرتا ہے' - اسے یہ حق حاصل نہیں ہوتا کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ کہہ سکے یا کر سکے'

غالباً ۸۰ء کی بات ہے کہ مجھے اطلاع کی گئی کہ تمہاری آئندہ منزل جرمنی کے صوبے " رائن لینڈ فالس " کی مقام "سٹولن" میں ہے جہاں سیاسی پناہ گزینوں کا ہیڈ کوارٹر بنایا گیا تھا' یہاں پر منتقل ہوا تو معلوم ہوا کہ یہ مقام آخر نہیں بلکہ اس سے آگے جہاں اور بھی ہیں !!

کیونکہ ہیڈ کوارٹر سے چھانٹی کر کے مزید آگے کی جانب لوگوں کو بھیجا جا رہا تھا مارچ کا آخری ہفتہ تھا کہ ہمیں بتایا گیا کہ ہم نے بون کے قریب ایک مقام کوبلنز کے لئے روانہ ہونا ہے - ٹرین میں بیٹھ کر کوبلنز چلے گئے میرے ہمراہ' 5 پاکستانی اور دیگر اقوام کے باشندے بھی تھے - کوبلنز میں ہمیں جرمن زبان کا چھ ماہ تک ایک کورس مکمل کرنا تھا تا کہ جرمن زبان پر ہمیں عبور حاصل ہو سکے اس کے بعد پھر

دوسرا مرحلہ آئے گا جس میں قسمت کے مزید فیصلے کئے جائیں گے ہمیں یہاں پر کھانے پینے کے علاوہ جو بہت کم مقدار میں خرچ مہیا کیا جاتا تھا جس سے ہم غیر مطمئن تھے اور خواہشمند تھے کہ کسی طرح کوئی کام کاج وغیرہ مل سکے تو اپنی معاشی حالت کو ذرا درست کر سکیں لیکن قانونی طور پر اس کی اجازت نہ تھی ان چھ ماہ کے دوران سیاسی پناہ گزینوں کے قوانین میں مزید سختی برتی گئی اور قانون خاصے سخت بنا دیئے گئے جن میں سر فہرست یہ بات تھی کہ کوئی بھی شخص ایک سال تک کوئی کام نہیں کر سکتا اس کشمکش میں چھ ماہ تک ہم پڑھائی پر بھی غور نہیں کر سکے کیونکہ ذہنی طور پر سخت پریشنی میں کیا خاک پڑھائی ہو گی یہ تو کام ہے آسودہ حال لوگوں کا ہم تو جن مراحل سے گزر رہے تھے وہ جان لیوا تھے۔

پڑھائی کے لئے مختص چھ ماہ کے اختتام پر ہمیں ایک دوسری جگہ idar oberstein منتقل کر دیا گیا جہاں ہمیں اپیل کا فیصلہ ہونے تک قیام کرنا تھا یہاں ہم بذریعہ ٹرین پہنچے سوشل سکیورٹی کا اہلکار ہمیں لینے سٹیشن پر موجود تھا میرے ہمراہ 5 پاکستانی اور 2 انڈین تھے یہاں ہمارے لئے رہنے کے لئے بڑا عمدہ انتظام تھا یہاں سوائے کھانے پینے اور سارا سارا دن گھومنے کے اور کوئی کام نہ تھا اور اب یہاں پر ایک دوسرا فائدہ یہ تھا کہ خرچ بڑھا کر 300 مارک ماہانہ کر دیا گیا تھا آہستہ آہستہ نہ صرف میں یہاں کے ماحول سے مانوس ہو رہا تھا بلکہ محدود پیمانے پر سیاسی سرگرمیوں کا آغاز بھی کر دیا تھا جب کہ انگلینڈ، جرمنی کے اندرون علاقوں میں رہنے والے جو کوئی واقف کار تھے ان سے بھی رابطے شروع کر دیئے

مارچ 1981 میں یہاں پر مصطفےٰ کھر نے دورہ کیا تو میں ان کے ہمراہ رہا۔ میں ان کے دورے کی کوریج کر کے انگلینڈ کے اخبارات کو ارسال کرتا رہا اس سے نہ صرف مجھے مصطفےٰ کھر کو قریب سے دیکھنے بلکہ ان سے سیاسی طور پر اپنے علم میں اضافہ کرنے کا سنہری موقع ہاتھ لگا اسی سال کی بات ہے کہ جب شاہ نواز بھٹو نے بھی جرمنی کا دورہ کیا تو ان سے نہ صرف ملاقات ہوئی بلکہ پورا ایک ماہ ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا اس دوران ہم پاکستان میں بحالی جمہوریت کے لئے مختلف مقامات پر تقاریب کا اہتمام کرتے جہاں ان کی شعلہ بیان تقاریر سے سامعین نہ صرف

محفوظ ہوتے بلکہ انہیں صورتحال کو سمجھنے کا موقع ملتا یہ ان کے والد کی شہادت کے بعد ان کا جرمنی کا پہلا دورہ تھا جس کا مقصد پیپلز پارٹی کو یہاں منظم کرنا اور پاکستان میں جمہوریت کے قیام کے لئے دوبارہ نہ صرف جدوجہد کرنا بلکہ عالمی رائے عامہ کو اپنے حق میں ہموار کرنا بھی تھا

ڈاکٹر غلام حسین بھی اس دوران سویڈن سے یہاں آگئے ان کی آمد پر ان کے ساتھ کام کرنے اور بہت کچھ سیکھنے کا موقع ملا

انہوں نے سویڈن سے واپسی پر یورپ کے دوروں کا آغاز کیا جس کا مقصد محض سیر و تفریح نہیں بلکہ پارٹی کو منظم کرنا تھا ان کی مقبولیت میں روز افزوں اضافے سے بوکھلا کر چند تخریبی ذہن کے لوگوں نے جو بظاہر ان کے دوست تھے ان کے خلاف منظم انداز میں پروپیگنڈہ شروع کر دیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کا پیپلز پارٹی کا اعلیٰ قیادت اور ڈاکٹر غلام حسین کے درمیان اختلافات کا آغاز ہو گیا لیکن عوام ان کی پارٹی کے لئے کی جانے والی خدمات سے باخبر تھے اور یہی وجہ ہے جب انہوں نے طویل جلاوطنی کے بعد پاکستان آکر مختصر نوٹس پر انتخابات میں حصہ لیا

یہ سب سلسلہ آہستہ آہستہ چلتا رہا اور پھر ایک موقع آیا کہ جب یہاں پر تنظیمی عمل شروع ہو گیا' مجھے اطلاعات و نشریات کے شعبہ کے علاوہ سینٹرل کمیٹی کارکن بھی نامزد کیا گیا' اس طرح جرمنی میں بھی بڑے پیمانے پر سیاسی سرگرمیاں شروع ہو گئیں کیونکہ لاتعداد لوگ یہاں آرہے تھے جن میں کچھ تو واقعی سیاسی کارکن تھے لیکن اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو صرف اپنے معاشی مسائل سے نمٹنے اور پیسہ کے زیادہ حصول کے لئے جرمنی آئے تھے اب یہاں پر جو ہوشیار قسم کے لوگ تھے انہوں نے اس سیاسی پلیٹ فارم کو استعمال کرنا شروع کر دیا کیونکہ اس میں ان کا صرف اور صرف ذاتی مفاد پنہاں تھا- جو لوگ ذرا کھل کر سیاست کرنے لگے تھے انہیں سیاسی پناہ کے حصول میں خاصی آسانی میسر آجاتی تھی اس طرح یہاں پھر ایک کھچڑی سی پکنے لگی اور یہ تنظیم مختلف گروہوں میں بٹنا شروع ہو گئی اس گروہ بندی میں سب سے اہم کردار پاکستان سفارتخانے نے ادا کیا جو حکومت کی ایما پر مقامی طور پر لوگوں میں پھوٹ ڈالنے کا عمل شروع ہو گیا اس مقصد کے لئے مختلف حیلے بہانے

تراشے گئے ' ہتھکنڈے اور حربے استعمال کئے گئے مفاد پرستوں میں پیسہ تقسیم کیا گیا لیکن ہم چونکہ مخلصانہ طور پر بھٹو ازم کے لئے کام کر رہے تھے لہٰذا مایوس ہو جانا قدرتی سی بات تھی بعض لوگوں کی اس حرکت پر ندامت بھی ہوئی اور غصہ بھی آتا لیکن کیا کر سکتے تھے ' سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا کہ سیاست کے ساتھ ساتھ اپنے معاشی مسائل کے حل کا بھی کوئی ذریعہ تلاش کیا جائے کیونکہ خدا نخواستہ تاوقتیکہ کسی وجہ سی واپس پاکستان آجانا پڑتا تو ہمیں ملک میں سوائے جیل کے اور کوئی جگہ نہ تھی اور یہ امید تو کرنا ہی بے وقوفی تھی کہ کوئی پارٹی لیڈر ہماری رہائی کے لئے کام کرتا لہٰذا عافیت اسی میں جانی کہ اپنے معاشی مسئلہ کو حل کرنے کے لئے کوئی کام دھندا تلاش کیا جائے۔

24

کیس کا فیصلہ

اس دوران میرے کیس کی حتمی فیصلہ بھی ہو چکا تھا اور مجھے مستقل طور پر رہنے اور کام کرنے کی اجازت دیدی گئی تھی میں غالباً واحد آدمی تھا جس کے کیس پر عدالت کے اس فیصلہ کے خلاف وزارت داخلہ نے کوئی اعتراض کیا نہ اپیل کی' جو کہ قانونی طور پر ان کا حق ہے میرے کیس کا فیصلہ عدالت کے فل بنچ نے متفقہ طور پر میرے حق میں کیا تھا اگرچہ مجھے کام کرنے کی اجازت تو مل گئی تھی - لیکن قانونی طور پر میں صرف وہیں کام کر سکتا تھا جہاں میں رہ رہا تھا لیکن چونکہ وہاں کوئی صنعتی میدان نہ تھا- جس کی وجہ سے اکثر بیروزگاری کا سامنا کرنا پڑتا تھا میں بڑا پریشان ہوا اور دن رات سوچنے لگا کہ آخر اب کیا کروں اب جبکہ حالات اتنے سازگار ہیں تو کام کے بغیر مزا نہ آئے گا-

لیکن کوئی راہ دکھائی نہ دیتی تھی اور ایک راہ ضرور تھی کہ اگر مجھے کسی دوسرے مقام پر کام مل جائے تو پراکثر اوقات انسانی ہمدردی کے تحت پولیس اس کی اجازت دے دیتی ہے- کیونکہ یہ ان کے خیال میں انتظامیہ کے لئے بھی بہتر ہوتا ہے- کیونکہ اس طرح ان پر معاش بوجھ کم ہو جاتا ہے - بہر حال میں نے کوشش جاری رکھی اور ساتھ والی تحصیل میں رہنے والے میرے ایک دوست محمد یونس جنہوں نے اس سے قبل بھی میرا متعدد مرتبہ ساتھ دیا اور مدد کی تھی انہوں نے اس فیکٹری میں میرے لئے کام تلاش کر لیا جہاں وہ خود بھی ملازم تھے میں تو بھاگم بھاگ وہاں پہنچا اور فیکٹری سے کام شروع کر دینے کا پروانہ حاصل کیا لیکن اس سے قبل یہ ضروری تھا کہ میں پولیس سے بھی اس کا باقاعدہ اجازت نامہ حاصل کروں سو! یہ رسمی کاروائی پوری کرنے کے لئے میں اگلے روز متعلقہ اس پولیس سٹیشن پہنچا جہاں پر غیر ملکی

جرمنی میں شاہنواز بھٹو مرحوم کے ہمراہ معروف گفتگو ۔ سیمعید عثمان بھی ہمراہ ہیں "

باشندوں کے امور کو نمٹایا جاتا ہے جہاں جا کر پہلی مرتبہ مجھے نہ صرف احساس ہوا - بلکہ یہ احساس دلایا گیا کہ اس قدر فلاحی ریاست میں بھی بعض مقامات پر نسلی تعصب پایا جاتا ہے - شاید اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ جرمنی میں ان دنوں بے شمار غیر ملکی گھس آئے تھے - جو مقامی حکومت کے لئے مسلسل دردسر بنے ہوئے تھے - جرمنی میں متعدد مسائل ان کی وجہ سے پیدا ہو چکے تھے لیکن جرمن حکومت اپنے ہی بنائے ہوئے قوانین کے ہاتھوں مجبور تھی اور ٹکا سا جواب دینے کی بجائے مختلف طریقوں سے تنگ کیا جاتا تھا - جس کا مقصد محض یہ تھا کہ یہ لوگ خود ہی تنگ آ کر یہاں سے واپس اپنے ملکوں کو روانہ ہو جائیں گے -

میں ذکر کر رہا تھا کہ میں پولیس سٹیشن گیا --- جی ہاں - وہاں میں ایک پولیس افسر کے پاس گیا اور اسے اپنا مدعا بیان کرتے ہوئے کہا کہ مجھے فلاں مقام پر کام مل گیا ہے اور جناب اب صرف آپ کی اجازت کی ضرورت ہے ---- لیکن وہ شاید پہلے ہی جلا بھنا بیٹھا تھا مجھ پر تو جیسے برس پڑا اور کہنے لگا کہ ہم تمہیں وہاں کام کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے - میں نے پوچھا کیوں - اس نے جواب دیا کہ میں اس کیوں کا جواب دینے کی پوزیشن میں نہیں ہوں - لہٰذا آپ جا سکتے ہیں - میں نے اسے کہا کہ جناب آپ کو شکر ادا کرنا چاہئے کہ ایک شخص کو کام مل رہا ہے اور آپ سے اب وہ بیروزگاری الاؤنس کا مطالبہ نہیں کرے گا - لیکن شاید اس نے مجھے لیٹر نہ دینے کی حتمی قسم اٹھا رکھی تھی - میں بڑا سٹپٹایا لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا کہ وہاں پر ہمارے جرمن باشندے بھی بڑی تعداد میں بے روزگار ہیں - ہمیں پہلے ان کا بندوبست کرنا ہے -

مجبوراً مجھے انسانی ہمدردوں کے ایک دو اداروں سے رجوع کرنا پڑا انہیں جا کر سارا قصہ سنایا - یہاں یہ خوب ہے کہ آپ جس کو چاہیں جائز حقوق کے حصول کے لئے عدالت میں یا سماجی اداروں میں لے جائیں - اس سے کم از کم آپ کے دل کی بھڑاس تو نکل پائے گی ان ادارے والوں نے نہ صرف اس بدمزاج پولیس آفیسر کو خطوط لکھے - بلکہ ٹیلیفون پر بھی سمجھانے کی کوشش کی 'اخلاقیات کا سبق سمجھایا لیکن اس کا ایک ہی جواب تھا کہ میں اس شخص کو کسی صورت وہاں کام کرنے کی

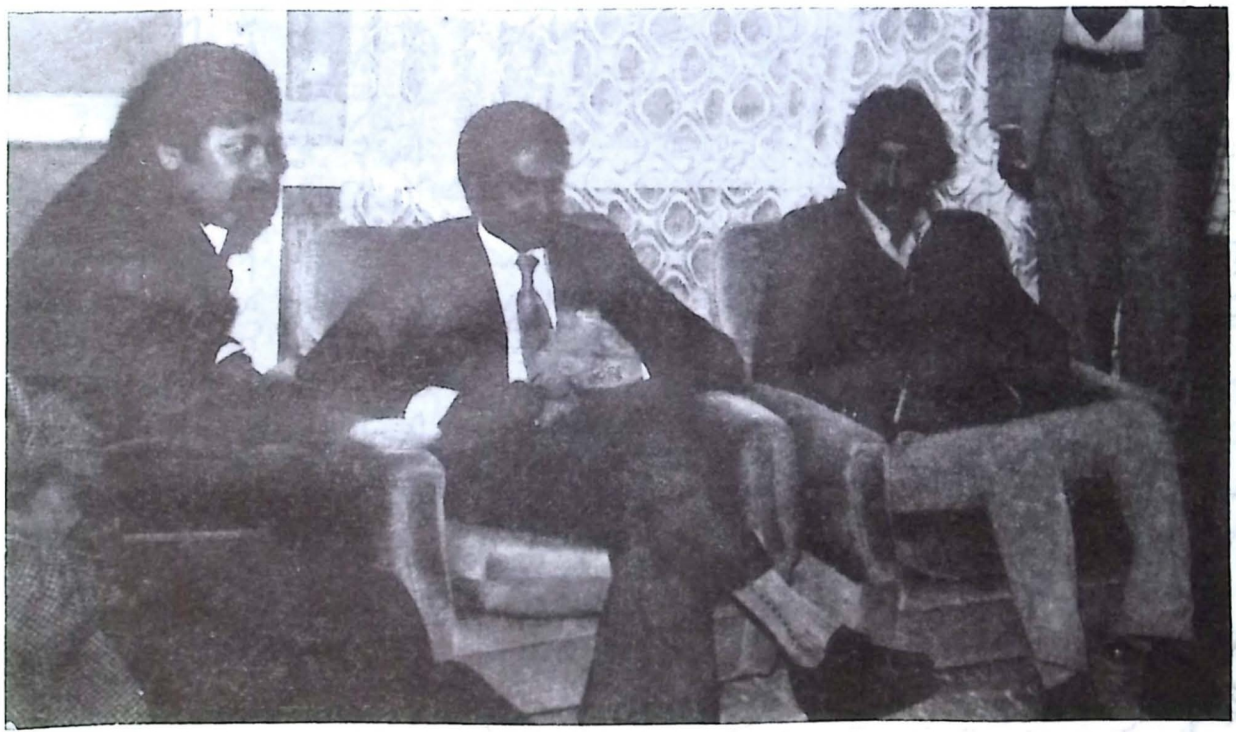

فرینکفوٹ مغربی جرمنی میں مصطفےٰ کھر کے ہمراہ

اجازت نہیں دے سکتا اور اس طرح میں مجبوراً ایک پولیس آفیسر کی ہٹ دھرمی اور اس کے نسلی تعصبات کی انتہا پسندی کے باعث واپس لوٹ آیا۔

پریشان تھا کہ آخر کیا کروں کئی مرتبہ تو اسقدر دل برداشتہ ہوا کہ واپس وطن چلا جاؤں۔ لیکن وہاں بھی پہلے والی صورتحال استقبال کرنے کو موجود تھی۔ میں ایک ایسے دوراہے پر موجود تھا کہ بیان نہیں کر سکتا۔ ادھر جاؤں یا ادھر' ذہن کسی قسم کے فیصلے پر پہنچنے سے قاصر تھا۔ اس گو مگو کی کیفیت میں میرے ایک دوسرے دوست جو میر پور کے ہی رہنے والے ہیں انہوں نے میری تحصیل سے چار سو کلو میٹر دور جہاں وہ رہائش پذیر بھی تھے اور کام کرتے تھے وہاں پر ہی میرے لئے ایک دوسری فیکٹری میں کام تلاش کر لیا ایک مرتبہ پھر پہلے کی سی حالت تھی' یعنی کہ مجھے ایک مرتبہ پولیس یاترا کے لئے جانا تھا اس لئے کہ پولیس سے اجازت لینا تھی کہ میں فلاں مقام پر کام تلاش کرنے میں کامیاب ہو گیا لیکن ضروری تھا کہ مجھے قانونی طور پر پولیس لیٹر جاری کرے لیکن افسوس کہ اس مرتبہ میں نسلی تعصب کی بھینٹ چڑھ گیا اور مجھے صاف لفظوں میں انکار کر دیا گیا ان دو واقعات نے میرے دل میں خصوصاً جرمن لوگوں خصوصاً پولیس کے لئے نفرت کے جذبات کو ابھارنے میں خاصا اہم کردار ادا کیا اگرچہ میں ماضی کی طرف دوڑاتا ہوں تو صورتحال بڑی خوشگوار دکھائی دیتی ہے۔

لیکن ان واقعات نے مجھ پر یقیناً یہ انکشاف کیا تھا کہ دنیا کے ہر خطے میں اچھے اور برے لوگوں کی موجودگی یقینی امر ہے۔ لیکن میں کوشش کرتا کہ دو آدمیوں سے ساری قوم کا موازنہ کرنا مناسب نہیں اور اس طرح میں نے اپنے دل کو اپنی مدد آپ کی تحت صاف کرنے میں خاصی کامیابی حاصل کی۔ لیکن چونکہ میں اس فیصلہ سے براہ راست متاثر ہوا تھا۔ لہٰذا میں نے یہاں کے دیگر سماجی اداروں کے علاوہ اس وقت کے چانسلر کوہل کو بھی ایک خط لکھا کہ جناب! میں نے تو یہ سنا تھا کہ مغربی جرمنی ایک ویلفیئر سٹیٹ ہے جہاں پر تمام انسانوں کو برابری اور آزادی سے رہنے کام کرنے اور جینے کا حق حاصل ہے۔ لیکن میں نے تو یہاں پر الٹ معاملہ پایا۔ کیونکہ مجھے میری خواہش کے مطابق کام نہیں کرنے دیا جا رہا' جو سراسر ناانصافی ہے۔ جس کا ازالہ جلد

از جلد کر دیا جائے - اور اگر یہ نہیں ہو سکتا تو مجھے مطلع کیا جائے تا کہ میں کسی دوسرے ملک کا رخ کر سکوں - کیونکہ میں یہاں کسی تحصیل کی حدود میں قید ہونے نہیں آزادی کی زندگی بسر کرنے آیا ہوں - اور اگر آپ ایسا نہیں کر سکتے تو میں اپنے وطن واپس جانا زیادہ پسند کروں گا - جہاں اگرچہ مجھے زندگی کے سفر میں کچھ مشکلات اور مصائب کا سامنا کرنا پڑے گا - کہیں کم از کم میں اپنی زمین پر تو رہوں گا جہاں جب ہی میرے اپنے اور غم خوار رہوں گے -

اس خط کو جب میں پوسٹ کرنے جا رہا تھا تو دل میں یہ سوچ رہا تھا کہ اگر اس کا جواب منفی انداز میں آیا تو پھر واقعتا میں یہاں سے کسی دوسرے ملک چلا جاؤں گا چاہے اس میں مجھے کتنا ہی نقصان کیوں نہ برداشت کرنا پڑے - لیکن میں نے دیکھا کہ مجھے چند روز بعد آملنے والا خط کا جواب کسی ماہر کلرک کی پیشہ وارانہ عمدہ اور پر کشش تحریر سے مزین تھا - جس میں نہ تو انکار تھا اور نہ ہی اقرار تھا بس اتنا درج تھا کہ آپ بے فکر رہیں متعلقہ محکموں کو ہدایات کرا دی گئی ہیں - آپ کے کیس پر جلد غور ہو گا - یہ الفاظ وہی ہیں جو پاکستان میں بے بس اور بے آسرا لوگ اپنے مسائل کے حل کے لئے اعلیٰ حکام کو ارسال کرتے ہیں - لیکن وہاں سے انہیں ایک پہلے سے ٹائپ شدہ کاغذ پر خالی جگہ کو ان کے نام سے پر کر کے ان کے دئے ہوئے ایڈریس پر روانہ کر دیا جاتا ہے - میری اگرچہ اس سے تسلی تو نہ ہوئی البتہ یہ ضرور ہوا کہ میرے دل کا غبار کسی حد تک دھل گیا -

اس کے کچھ ہی عرصہ کے بعد مجھے پھر تمام جرمنی میں کام کرنے کی اجازت مل گئی -

بس پھر کیا تھا میں نے سرگرمی سے کام کی تلاش شروع کر دی ایک جگہ مناسب مل گئی سات یا آٹھ ماہ ملازمت کی' لیکن یہاں کوئی خاص فائدہ نہ تھا' بعد میں اس ملازمت کو خیرباد کہا اور اپنا ذاتی چھوٹا سا کام شروع کرنے کا فیصلہ کر لیا اور پھر اب میں اپنے سٹال لگا رہا تھا جن میں تھوڑا سا کپڑا' اور پلاسٹک کی جیولری فروخت کرتا' اور یہ کام میں مختلف شہروں میں خانہ بدوشوں کی سی صورت میں کر رہا تھا' حالات پلٹا کھانا شروع ہو گئے' کیونکہ میں یہاں بالکل اسی انداز کے بازاروں میں کام کر رہا تھا

جیسے کہ پاکستان میں جمعہ یا اتوار بازار لگتے ہیں جو لوگ یورپ میں رہ کر گئے ہیں یا رہ رہے ہیں وہ بخوبی جانتے ہیں کہ یہاں گرمیوں میں ہر محلے گلی میں بڑی پلاننگ کے ساتھ میلے منعقد ہوتے ہیں جہاں نت نئی چیزیں فروخت ہوتی اور خریدی جاتی ہیں- مجھے بڑی اچھی طرح یاد ہے کہ میں لگاتار کوئی کئی ماہ تک 18 سے 20 گھنٹے روزانہ بھی سٹال پر کام کرتا رہا ہوں اور مزے کی بات یہ ہے کہ بعض اوقات ایک شہر میں سٹال لگایا تو شام کو وہی سٹال اکھاڑ کر ڈیڑھ دو سو کلہ میٹر دور کسی دوسرے شہر میں ڈیرہ جمالیا اور پھر اس صورت میں آپ خود اندازہ کر سکتے ہیں کس قدر وقت آرام کے لئے میسر آتا ہو گا-

جب کہ سردیوں میں جب عموماً منفی 20 درجے تک سردی پڑ رہی ہو تو فضا میں کام کرنا جب کہ کھولتا ہوا پانی دس منٹ کے لئے باہر رکھیں تو وہ بھی برف بن جائے گا کس قدر مشکل ہے- لیکن میں تو شروع سے مصیبتوں سے کھیلتے آیا تھا- لہٰذا خدا کا نام لیکر میدان عمل میں کود پڑا اور یہی وجہ تھی خدا تعالیٰ نے محنت کا صلہ دینا شروع کر دیا تھا- میں یہاں یہ ذکر ضرور کروں گا میری اس ساری محنت اور اس کے نتیجے میں ملنے والی کامیابیوں میں میری جرمن بیوی کا بہت بڑا ہاتھ تھا- جو نہ صرف میرے کاروبار کی باقاعدہ شراکت دار تھی بلکہ میرے امور کو خوش اسلوبی سے چلانا بھی اس کا کام تھا- اس کی اسقدر معاونت سے میرے سر سے تقریباً آدھا بار اتر جاتا اور میں کسی قدر اطمینان سے اپنے کام کی نگرانی کر سکتا تھا- سٹال لگاتے لگاتے اچانک ہی مجھے جرمن کے ایک تاریخی شہر ٹریئر میں ایک مناسب دکان مل گئی-

25

تجارت کا آغاز

Trire شہر کی تاریخ 2 ہزار سالوں پر محیط ہے جہاں مشہور زمانہ سائنس دان کارل مارکس نے بھی جنم لیا جس کی جائے پیدائش کو جرمن حکومت نے محفوظ کر لیا ہے جسے یہاں آنیوالے ہزاروں سیاح دیکھتے اور تاریخ سے سبق حاصل کرتے ہیں یہ شہر جرمن، لکسمبرگ اور فرانس کی سرحد پر واقع ہے - یہاں کی سب سے بڑی پیداوار انگور ہے جس سے دنیا کی سب سے اعلیٰ شراب کشید کی جاتی ہے - چاروں جانب سے پہاڑوں کے درمیان گھرے اس شہر کے لوگ بہت اچھے، ملنسار خوش اخلاق اور محنتی ہیں - جرمن کے دیگر شہروں کی نسبت اسے گاؤں کہنا زیادہ بہتر ہو گا - جہاں کی فضا یکدم پرسکون اور بھاری ٹریفک کے شور سے مبرا ہے - یہاں میری زندگی کی بڑی سنہری یادیں وابستہ ہیں - یہیں سے میں نے اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا اور آج خدا کے فضل سے میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو چکا ہوں اس شہر میں 2 ہزار سال قبل رومن آباد تھے اور یہ ان کا سلطنت کی دارالحکومت تھا -

یہاں ملنے والی دکان جس کے لئے میں نے دکان مالک سے دس سال کا معائدہ کیا تھا بدقسمتی سے کامیاب نہ ہو سکی اس کی اور تو کوئی ایسی وجہ نہ تھی بلکہ یہاں پر ایک بہت بڑی سپر مارکیٹ کا قیام اس کا سب سے بڑا سبب تھا اس لئے میں ہی نہیں بلکہ دوسرے پرانے دکاندار بھی بڑے متاثر ہوئے تھے، اور یہ تو بڑی عجیب سی بات تھی کہ میں اب چھ ماہ بعد ہی دکان چھوڑ دوں جبکہ معائدہ دو سال کا ہو چکا تھا میں نے دکان کے مالک سے بات کی تو بڑا جذبز ہوا اور اس نے کہا کہ معائدہ کی جو شرائط ہیں وہ پور کر دو تو میں تیار ہوں - میں بڑا پریشان ہوا کہ میں تو پہلے ہی بہت خسارہ برداشت کر چکا ہوں - اب کیا کروں - اس صورت میں چونکہ دوسرے دکاندار بھی متاثر ہوئے تھے سب نے مل

کر عدالت میں درخواست دے دی ہمیں اس مصیبت سے نکالا جائے اس کا کیس بڑ
عرصہ چلتا رہا۔اس دوران میں نے ایک مرتبہ پھر سٹال لگانے کا سلسلہ شروع کر دیا
کیا کرتا آخر کار ضروریات زندگی کے حصول کے لئے ہمیں کہیں تو ہاتھ پاؤں مارنا تھا
تھا۔اور یہ سلسلہ پورا ایک سال تک جاری رہا اس دوران البتہ یہ ہوا کہ میں نے خاطر
منافع کمایا اور جو دکان کی وجہ سے نقصانات ہوئے تھے انہیں بھی کس قدر پورا
کرنے میں مدد ملی۔

جس کے بعد مجھے اس شہر میں ایک دوسری دکان مل گئی ایک مرتبہ پھر ایک سہارا
جیسے مل گیا ہو' میں نے ایک بار پھر اللہ کا نام لیکر اس دکان میں کام شروع کر دیا۔اور
ہول سیل کی تجارت کا آغاز کیا جس میں نتیجہ توقع سے زیادہ حوصلہ افزاء ہوا۔اور
معاملہ یہاں تک جا پہنچا کہ میں نے اٹلی اور انگلینڈ سے بھی ریڈی میڈ مال منگوانا شروع
کر دیا۔میں تجارت میں اس بات کا قائل تھا کہ جو چیز خریدوں وہ معیاری ہو اور جس
گاہک کے ہاتھ فروخت کروں وہ اس سے مطمئن ہو سکے۔شاید خداوند تعالی کو میری
یہی نیک نیتی پسند آ گئی کہ میں اس میدان میں بھی دن دگنی رات چوگنی ترقی کرتا چلا
گیا اور کاروبار کی اس ڈگر میں اس نیک نیتی سے اب تک چل رہا ہوں۔جس کا نتیجہ
ہمیشہ مثبت اور خوشگوار رہا ہے۔

جب انسان کو کامیابی حاصل کرنے کا موقع ملے تو قدرتی طور پر اس کی حوصلہ
افزائی کا سامان پیدا ہو جاتا ہے۔لیکن یہ حقیقت بھی بہر حال ٹھوس امر ہے کہ ترقی کی
جستجو میں منزل مقصود تک بغیر پیسے کے پہنچنا مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔اور اب
میری بھی یہ خواہش تھی کہ میں زیادہ سے زیادہ ترقی کروں' اس خواہش کی تکمیل کے
لئے میں نے جرمنی سے باہر دوسرے ممالک میں یوں تو کاروبار کو وسعت دینے کا
سلسلہ شروع کر دیا تھا لیکن وہ واقعہ مجھے کبھی نہ بھولے گا جب ایک مرتبہ مارچ
1986 میں ریڈی میڈ گارمنٹس کی بڑی کھیپ وین میں لاد کر لندن سے جرمنی آ رہا
تھا جو ایک ہفتے میں میرا تیسرا کاروباری دورہ تھا' میرا تھکن اور نیند سے برا حال تھا
گذشتہ دو روز سے میں ایک لمحے کے لئے بھی سو نہ سکا تھا' ایسے میں لمبی ڈرائیو کرتے
ہوئے غنودگی آ ہی جاتی ہے۔میں بھی گاڑی چلاتے ہوئے سو گیا۔رات تقریباً ڈیڑھ

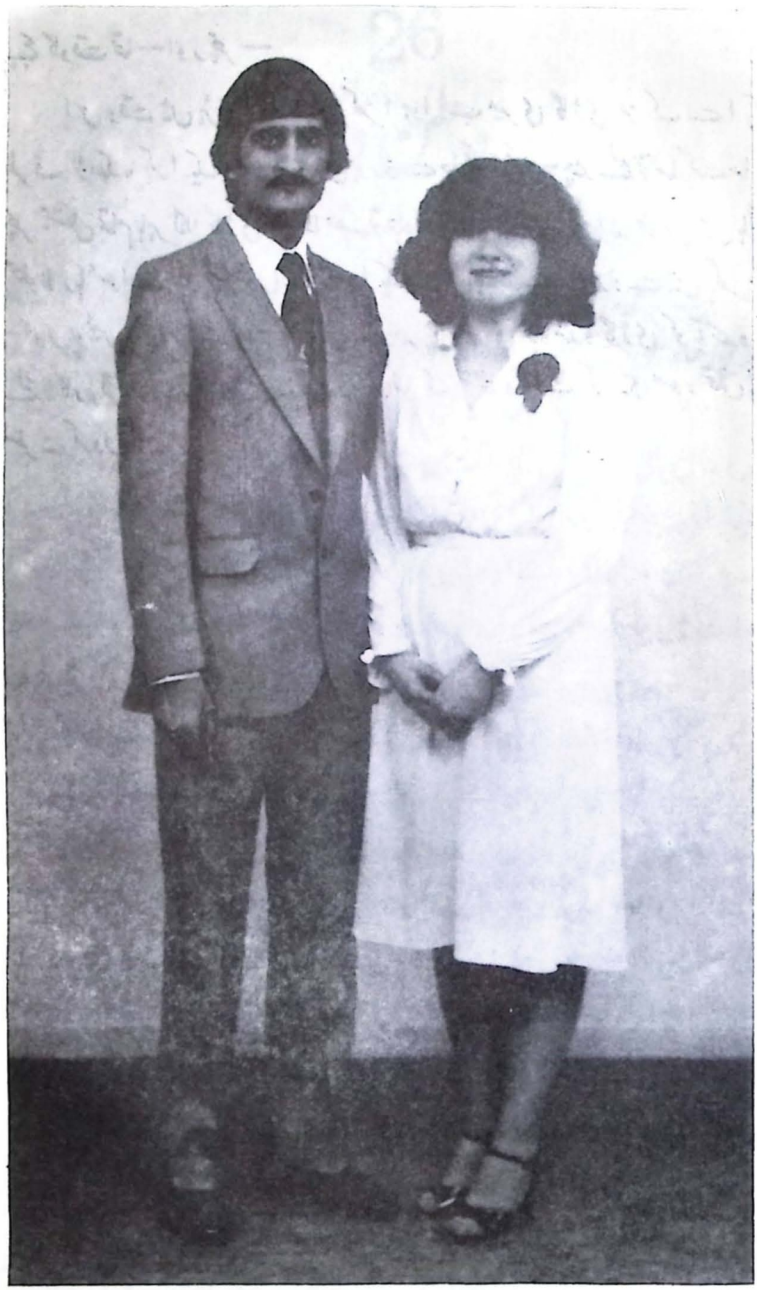

جرمن نژاد شریک حیات ثانیہ کھوکھر کے ساتھ ایک تصویر

بجے کا وقت تھا--اور پھر--

اس وقت میں ہڑ بڑا کر اٹھ کھڑا ہوا جب میری گاڑی سڑک سے ایک طرف لڑھک کر ایک دیو ہیکل سائن بورڈ سے جا ٹکرائی--چند لمحے تو ساکت سا رہا پھر بمشکل تمام باہر نکلا گاڑی کا اگلا حصہ تو تباہ ہو چکا تھا- لیکن معجزانہ طور پر میں بالکل محفوظ رہا' سوائے چند خراشوں کے'--ایک جرمن باشندے کی مدد سے میں گھر پہنچا -اور پولیس کو اطلاع دی---جس نے بعد میں میری تباہ شدہ گاڑی کو آئندہ کے لئے ناکارہ قرار دیدیا لیکن میں نے عہد کر لیا کہ آئندہ رات کو ایسی صورتحال میں سفر نہ کروں گا-

26
وطن واپسی

اب کہیں کہیں وطن جانے کے لئے دل میں خیال آتا لیکن چونکہ میں سیاسی پناہ گزین تھا وطن نہیں جا سکتا تھا لہٰذا خاموش ہو جاتا البتہ میں نے اپنے وطن سے محدود پیمانے پر ریڈی میڈ گارمنٹس کی تجارت شروع کر دی۔ 1987 میں مجھے جرمنی کی شہریت مل چکی تھی اپریل 1986 میں بے نظیر بھٹو بھی پاکستان گئی تھیں جہاں ان کا فقید المثال استقبال کیا گیا' اسی دوران میں چونکہ جرمن شہری بن چکا تھا لہٰذا فیصلہ کیا کہ پاکستان کا چکر لگایا جائے اور میں پھر فوراً پاکستان آ گیا اور میر پور پہنچتے ہی سیشن کورٹ میں جا کر ضمانت کروالی' کیونکہ مجھے اب بھی ڈر تھا کہ پرانے پولیس افسران موجود ہیں۔ کہیں کسی نئے یا پرانے کیس میں ہی نہ پھنسا دیں کیونکہ ہماری پولیس کی یہ روائت رہی ہے کہ وہ انصاف کے تقاضوں کو مدنظر رکھنے کی بجائے اپنی کارکردگی کو اعلیٰ افسران کے سامنے بڑھا چڑھا کر پیش کرنے اور یا پھر ذاتی انا کا مسئلہ بنا کر ہر شہری کو زندان کے پیچھے دھکیل دینے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کرتے اس صورتحال کو بہر حال تبدیل ہونا چاہئے ہم نہ صرف جمہوریت پسند قوم ہیں بلکہ مسلمان بھی ہیں اور ہمارا مذہب اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کوئی صاحب اقتدار کسی بے گناہ اور بے ضرر انسان کو محض ذاتی مخالفت یا کسی دوسرے کی خوشنودی کے لئے کسی مصیبت میں مبتلا کر دے۔ میں نے تمام چیزوں کو مدنظر رکھ کر ہی سیشن کورٹ سے قبل از وقت ضمانت کروائی تھی البتہ کچھ مقدمات کا سامنا بھی کیا اور پریس میرے خلاف اس قدر طویل عرصہ گزرنے کے بعد کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہ کر سکی'

میں جب ماضی کی طرف نگاہ دوڑاتا ہوں تو بہت سے واقعات ایسے بھی نگاہوں کے

سامنے گھوم جاتے ہیں جن کا ذکر میں اس سے پہلے صفحات میں نہیں کر سکا- مجھے یاد ہے کہ جب 84-1985 میں بے نظیر بھٹو جرمنی آئیں اور فرینکفوٹ میں جلسہ سے خطاب کیا تو میں نے ان سے ملاقات کی جبکہ بیگم نصرت بھٹو جب فرانس سے یہاں علاج کی غرض سے آئیں تو ان سے بھی میونخ میں میں نے ملاقات کی- 83-1982 کے بعد یہاں پر قانون خاصے سخت کر دیئے گئے تھے -وہ گہما گہمی نہیں تھی جو 80-79 میں تھی کیونکہ سیاسی پناہ کے لئے آنیوالوں کی تعداد خاصی کم ہو گئی تھی جو یہاں موجود تھے ان میں سے اکثریت جیلوں میں بند تھی جو لوگ باہر تھے اپنا بساط کے مطابق مارشل لاء کے خلاف کوئی نہ کوئی تقریب منعقد کر دیتے تھے-

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ فروری 1979 میں جب میں جیل میں تھا تو آزاد کشمیر کی تاریخ میں پہلی مرتبہ بھٹو کی رہائی کے لئے خواتین نے جلوس نکالا اس دوران مجھے ایک مرکزی لیڈر کے وہ الفاظ کہنا نہ بھولیں گے جس کا میں نام نہیں لوں گا اس نے کہا تھا کہ " زندہ بھٹو لاکھ کا اور مرا بھٹو سوا لاکھ کا" یعنی یہ لوگ اپنی دکانداری چمکانے کے چکر میں تھے ایسے لوگ ہی بھٹو کی پھانسی کے ذمہ دار ہیں اگر لیڈر حضرات مخلص ہوتے نتیجہ مختلف ہو سکتا تھا جب خواتین نے جلوس نکالنا چاہا تو میں کئی بڑے بڑے لوگوں کے پاس گیا اور درخواست کی جناب آپ اپنی گھریلو خواتین کو اس جلوس میں شامل ہونے کی اجازت دیں جس پر ہمیں صاف جواب دے دیا کہ ہماری بہو بیٹیاں جلوسوں کے لئے ہی رہ گئی ہیں- یہ وہ لوگ ہیں جو آج نہ صرف جمہوریت اور پیپلز پارٹی کے علمبردار بنے ہوئے ہیں بلکہ اگلی نشستوں پر بیٹھنے کے خواہشمند ہیں- ان کے اس منافقت سے پر کردار کو دیکھ کر بڑا افسوس ہوتا ہے جو بھٹو کے دور اقتدار میں ان کا نام لیتے نہ تھکتے اور جب ان پر مصیبت آن پڑی تو پہچاننے سے انکاری ہو گئے اور یہی حال پاکستان میں موجود پیپلز پارٹی کے بعض مرکزی رہنماؤں کا تھا جو صرف بھٹو کی لاش پر اپنی سیاست چلانا چاہتے تھے- یوں بھی ان کا خیال تھا کہ اب تو پیپلز پارٹی کبھی بھی برسر اقتدار نہیں آسکتی لیکن آفرین ہے اور لیڈروں اور کارکنوں پر جو ہر دور میں بھٹو اور پیپلز پارٹی سے مخلص رہے اور اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر بھی اس شخصیت اور پارٹی کا ساتھ نہیں چھوڑا-

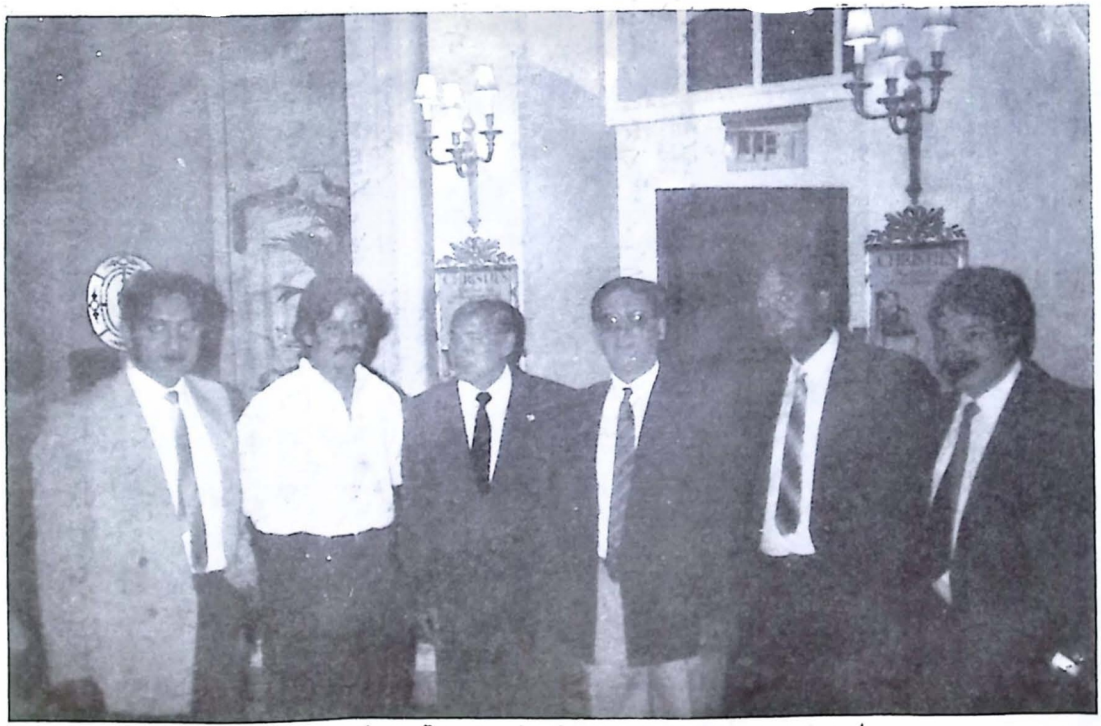

لندن میں وزیر داخلہ اعتزاز احسن کے دورہ کے موقع پر لی گئی ایک تصویر

ایسے میں مجھے وہ مخلص، بے لوث اور جذباتی کارکن کبھی نہ بھولیں گے جن میں میر عبدالرحمن مرحوم، میر خالد بشیر، چوہدری عبداللہ مرحوم، بشیر ندیم، ہمایوں پاشا، مدثر لون، شیخ نوید، مجید نقشبندی، چوہدری اعظم، غلام رسول عوامی، آفتاب باغی شیخ منظر مسعود اور شیخ ارشد برقی جیسے لوگ بھی شامل تھے جنہوں نے آمریت کے خلاف ہر موقع پر اس کی مخالفت کھل کر کی، بھوک ہڑتالیں کیں، جیلیں کاٹیں - اور انتقامی کاروائیوں کا نشانہ بنے -

میر پور کا ہی چھابڑی فروش چاندی خان مجاہد بھی میری آنکھوں کے گرد گھوم رہا ہے جو غریب تو ضرور لیکن بھٹو کے شیدائیوں میں سر فہرست تھا - یہ وہی چاندی خان ہے جو ہر اس شخص کو مفت کھانا کھلاتا جو بھٹو زندہ باد کا نعرہ لگاتا مارشل لاء کے دور میں اس کی چھابڑی پر پیپلز پارٹی کا جھنڈا لہراتا رہا -

مجھے وہ محمد صدیق سانولا بھی نہیں بھولا - جو جمہوریت اور بھٹوازم کی حمایت کے جرم میں متعدد مرتبہ جیلوں میں گیا جسے بجلی کے جھٹکے دیئے گئے پھر وہ دیوانہ ہو گیا - نیم پاگل !!

لیکن میرا ایمان ہے کہ ایسے دیوانے ہی ہمارا سرمایہ حیات ہیں جب تک یہ دیوانے ہماری صفوں میں شامل ہیں کوئی طاقت پیپلز پارٹی اور جمہوریت کے وجود کو ختم کرنے کا تصور بھی نہیں کر سکتی -

آزاد کشمیر میں پی ایس ایف جمعیت کے مقابلہ میں شاندار کامیابی حاصل کر چکی ہے

جیئے سندھ والے اپنی زندگی کی پرواہ کئے بغیر غریب عوام کے لئے لڑ رہے ہیں

پی ایس ایف کے کارکن جارحیت کے خلاف جدوجہد کریں گے

گورنمنٹ ڈگری کالج برائے خواتین میرپور

بورڈ میں تیسری پوزیشن حاصل کرنے والی طالبہ کو میڈل

صدر ضیاء کی میرپور آمد پر

طلباء کو حراست میں رکھا گیا

گورنمنٹ ڈگری کالج میرپور کے انتخابات بھی پی ایس ایف نے جیت لیے

اسلامی جمعیت طلباء کو شرمناک شکست

مسئلہ کشمیر

آزاد کشمیر پی ایس ایف کا ... جلوس

میرپور پبلک میں

دو طالب علم رضاکار

... میں مقبول ہیں

... کے مسائل حل کئے جائیں

ڈگری کالج

کشمیر کی پہاڑیوں

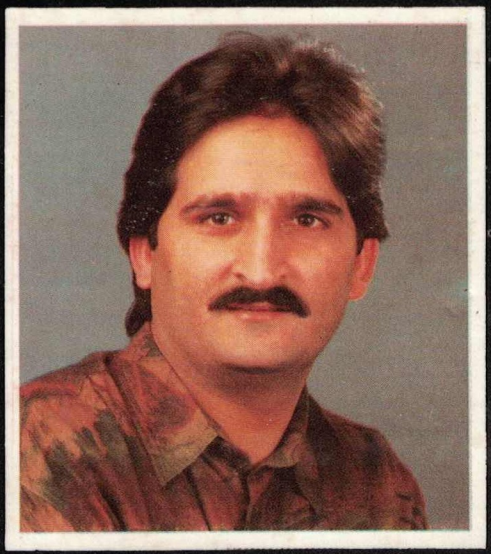

طاہر کھوکھر کی شخصیت محتاج تعارف نہیں، سن بلوغت سے تادم تحریر مسلسل جدوجہد اور اس کے نتیجے میں کامیابیوں کا حصول ان کا خاصا رہا ہے وہ 24 فروری 1961 کو میر پور آزاد کشمیر میں پیدا ہوئے گورنمنٹ ہائی سکول اور گورنمنٹ ڈگری کالج میر پور آزاد کشمیر میں تعلیم حاصل کی - ماہنامہ "سماج" کا اجراء اور مارشل لاء دور میں معروف قومی روزناموں میں ان کی دلیرانہ رپورٹنگ نے انہیں اس وقت حلقہ صحافت میں خاصا مقبول بنایا - ادبی صحافتی، سماجی، اور سیاسی خدمات میں پیش پیش رہے، جمہوریت کے جابرانہ خاتمے پر ۸ سال تک جلاوطنی کی زندگی گزاری وہ اب ملک میں ایک نوجوان صنعت کار کی حیثیت سے ممتاز مقام رکھتے اور مستقبل میں سیاسی میدان میں اپنی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا چاہتے ہیں، اب راولپنڈی میں مقیم ہیں "پوچھ مجھ سے" ان کی سیاسی زندگی کی روداد ہے، جو قارئین کے لئے یقینا سبق آموز اور دلچسپی کا سامان پیدا کرے گی -